

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فرقہ واریت اور اسلام

افادات

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب^{رحمۃ اللہ علیہ}

تسہیل و ترتیب

مولانا محمد عبد القوی

ناظم ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ، حیدرآباد

ناشر

برکات Barakaath بک ڈپو
Book Depot

خواجہ باغ، سعید آباد، حیدرآباد

فہرست مضامین

- ۱۔ تمہیدی باتیں
- ۲۔ نسبی فرقہ واریت اور اسلام
- ۳۔ قانونی فرقہ واریت اور اسلام
- ۴۔ تعظیمی فرقہ واریت اور اسلام
- ۵۔ وطنی فرقہ واریت اور اسلام
- ۶۔ معاشی فرقہ واریت اور اسلام
- ۷۔ سیاسی فرقہ واریت اور اسلام
- ۸۔ خلاصہ کلام

بسم الرحمن الرحيم

پیش گفتار

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى اما بعد!

ہندوستانی مسلمان تقسیم ملک کے وقت سخت بے چینی اور انتشارِ ذہنی کی کیفیت میں تھے، ایک طرف وہ اپنے وطن سے بے وطن اور نو تشکیل شدہ ملک میں منتقل ہونا ناپسند کر رہے تھے تو دوسری طرف خود اپنے ملک میں اقلیت اور اجنبیت کی صورتِ حال سے دوچار ہو رہے تھے؛ ایسے میں طرح طرح کے خطرات اور قسم قسم کے اندیشوں نے انہیں گھیر رکھا تھا، مشورے اور تجاویز الگ آرہی تھیں؛ کہا جا رہا تھا کہ ملک میں اگر مسلمانوں کو رہنا ہے تو اپنے تشخص اور اپنی شناخت کی قربانی دے کر رہنا پڑے گا؛ کمزور خیال اور ضعیف الاعتقاد لوگ ایسا کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھ رہے تھے، پختہ خیال اور مضبوط ایمان لوگ اس سے اختلاف تو کرتے تھے مگر کوئی اور صورت بھی ان کے سامنے نہ تھی؛ ان حالات میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی اور ہمت افزائی کی سخت ضرورت تھی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ملت کے ان مخلص و ہمدرد رہنماؤں میں سے ایک ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں پرورش پاتے اور ذہنوں میں پکتے ان سوالات کو اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے ان کا معقول جواب دینے کے لئے بروقت قلم اٹھایا اور اتنا مضبوط، اطمینان بخش اور ہمت افزا جواب عطا فرمایا کہ آج نصف صدی کے گزر جانے کے بعد بھی اس کی صداقت و حقانیت میں کوئی کمی نہ آئی اور آج بھی یہ مضمون مسلمانانِ ہند کی ٹوٹی ہمتوں کو جوڑنے والا اور بڑھتی مایوسیوں کو ختم کرنے والا ہے؛ پچاس سال قبل اس

مضمون کی مسلمانوں کو جس قدر ضرورت تھی آج بھی اسی قدر ضرورت ہے، نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے اندر مسلمانوں کے تئیں پھیلائے گئے اندیشوں اور غلط فہمیوں کے ازالے کے واسطے بھی یہ مضمون تیر بہ بدف ہے، اس حقیقت کا مضمون کے مکمل مطالعے کے بعد ہر قاری اعتراف کرے گا۔

حکیم الاسلامؒ کا یہ حکیمانہ مضمون انتہائی نافع اور مانع ہونے کے باوجود اصطلاحات کے بہ کثرت استعمال اور عربی و فارسی کے مشکل و نادر الفاظ و تعبیرات کی وجہ سے اس دور کے عام مسلمانوں کی استعداد اور فہم سے بلند تر تھا، اس لئے اس عاجز نے حضرت کے اس مضمون سے مکرر عبارات کو حذف اور مشکل الفاظ کی تسہیل کر دی ہے، جبکہ اصل عبارت اور مضمون میں کسی قسم کی تبدیل و تحریف کو راہ نہیں دی بلکہ حتی المقدور کوشش کی ہے کہ مضمون کا مواد اس کی سلاست اور قوت بیان متاثر نہ ہونے پائے، بعینہ قائم رہے، یہ کام اگرچہ بہت مشکل تھا اور اس کے لئے کئی مہینوں کا وقت صرف کرنا پڑا مگر ایک ایسے وقت اس کام کی تکمیل ہو کر طباعت کے لئے جا رہا ہے جب کہ پورے ملک کی فضا فرقہ واریت کے بدبو سے مملدہ اور ماحول پھوٹ و انتشار کا شکار ہے، مجھے امید ہے کہ ان حالات میں یہ مضمون ملت اسلامیہ ہی کے لئے نہیں تمام انصاف پسند اور حق شناس اقوام کے لئے بھی چشم کشا اور حوصلہ بخش ثابت ہوگا۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملت کے حق میں کی گئی اس سعی کو قبول فرمائے، میری غرضوں کو معاف فرمائے، اور مصنف رحمہ اللہ کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

محمد عبدالقوی غفرلہ

۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۷۷ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى اما بعد!
 ارشاد ربانی ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ
 شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
 خَبِيرٌ ﴿١٣﴾ (سورۃ الحجرات)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں شاخ در
 شاخ کیا اور خاندانوں میں اس لئے بانٹ دیا ہے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان
 سکو، اللہ کے نزدیک تم میں باعزت وہی ہے جو صاحب تقویٰ ہے۔

خطبہ مسنونہ کے بعد مصنفؒ نے مسلمانوں کے قلوب میں موجود جذبات و
 سوالات کو درج ذیل چار عنوانوں میں تقسیم کیا، پھر ان سب کا واحد حل دین فطرت
 یعنی ”اسلام“ سے وابستگی اور اس کی تعلیمات کو رو بہ عمل لانا ثابت کیا ہے۔
 ۱۔ بہ حیثیت ہندوستانی تمام ملکی و شرعی حقوق میں یکسانیت کا حاصل ہونا۔
 ۲۔ بہ حیثیت اقلیت اکثریت کی محتاجی اور رحم و کرم سے آزادی کا حاصل ہونا۔
 ۳۔ بہ حیثیت قوم ہندوستانی اقوام میں ایک معزز اور دوست قوم ہونے کا
 موقف حاصل ہونا۔
 ۴۔ بہ حیثیت مذہب مذہبی و تہذیبی شناخت ملحوظ رکھنے کی آزادی حاصل ہونا۔
 (آگے اصل مضمون ملاحظہ ہوں)

میرے نزدیک ان چاروں مسئلوں کا صحیح اور ٹھوس حل صرف ایک ہی ہے کہ آپ خدا
 کے اٹل قانون فطرت کے زیر سایہ زندگی بسر کریں، کیوں کہ فطرت پر رہنے ہی میں کُلّی وقار

وعزت اور امن و سکون ہے؛ جب کہ خلافِ فطرت زندگی گزارنے میں ہر نوع کی بے عزتی، بے وقعتی اور بے سکونی ہے؛ اگرچہ قانونِ فطرت ہی کا دوسرا نام اسلام ہے مگر میں نے شروع ہی میں اسلام کا لفظ اس لئے استعمال نہیں کیا کہ آج ملک میں فرقہ وارانہ فضا کی وجہ سے دماغوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا زہر پھیلا ہوا ہے، اور اس فضا میں جب بھی مذہب کا نام آتا ہے کہ اس کا ملکی معاملات میں کچھ دخل ہے تو لوگوں کے ذہن فوراً ہی اس کشیدگی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس کی گردن پر لاکھوں بندگانِ خدا کا خون ہے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس نام کو بھی شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھا جانے لگتا ہے۔

لیکن میں عرض کروں گا کہ اگر میں قانونِ فطرت کے لئے اسلام ہی کا لفظ استعمال کروں اور پولیٹیکل معاملات میں اس کا ذکر چھیڑوں تو آپ ڈریں نہیں، اسلام دنیا میں تعصبات یا فرقہ وارانہ کشیدگیاں اور دھڑے بندیاں کرنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ وہ تو ان تفرقوں کو مٹانے کے لئے آیا ہے، اخلاقی طور پر بھی اور قانونی اعتبار سے بھی؛ یعنی اسلام اپنی اصولی اور قانونی حیثیت میں بھی اختلاف اور جتنے بندیوں کی گنجائش نہیں رکھتا، بلکہ آپسی اتحاد اور اس سے بھی آگے بڑھ کر بین الاقوامی اتحاد کا پیغام لے کر آیا ہے؛ اس سے معلوم ہوا کہ اختلافِ اسلام کا ثمرہ نہیں، اسلام سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہے؛ فرقے بنتے ہی ہیں اس سے ہٹ جانے اور اسے چھوڑ بیٹھنے کی وجہ سے، ورنہ اسلام نے دعویٰ کیا ہے کہ انسانی پیدائش کی ابتدا میں جب دنیا کے انسان مجھے پکڑے ہوئے تھے تو وہ امت واحدہ تھے اور ان میں کوئی فرقہ واریت نہ تھی، لیکن بعد میں جب انسانوں نے مسیری رسی چھوڑ دی اور خود رائی پر آگئے تو فرقے بن گئے، پھر بھی میرے ہی داعیوں نے ان کی فرقہ واریت کو مٹانے کی کوشش کی اور بہت کچھ مٹایا بھی، مگر بعض نے مانا اور بعض نے نہ مانا، اور ان کی دعوت رد کر کے اپنے اسی انتشار اور پراگندگی پر جمے رہے؛ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكَمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٣﴾

(سورة البقرہ)

پہلے سب آدمی ایک ہی راستے پر تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوش خبری سناتے اور ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ سچی کتاہیں بھی نازل فرمائیں، تاکہ لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا فیصلہ کر دے، اور اس کتاب میں اختلاف انہی لوگوں نے کیا جن کو وہ کتاب ملی تھی، باوجود یہ کہ ان کے پاس واضح دلائل پہنچ چکے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں اختلاف کیا کرتے تھے اپنے فضل سے بتلادیا، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس کو راہ راست بتلادیتے ہیں۔

پھر ابتدائی انسانوں کی طرح آخری دور کے بارے میں بھی اس نے دعویٰ کیا کہ دنیا بالآخر پہلے کی طرح آخر میں بھی مجھے ہی پکڑے گی، اور لوگ مجبور ہو کر اور ہر طرف سے تنگ آ کر میرے ہی دامن میں پناہ لیں گے تو وہ پھر سے ایک ہی گروہ بن جائیں گے اور ان کی یہ فرقہ واریتیں پھر سے مٹ جائیں گی؛ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا يبقى على ظهر الارض بيت
مدر ولا وبر الا وادخله الله كلمة
الاسلام بعز عزيز وذليل، قال

زمین کی پشت پر کوئی مٹی اور کپڑے کا مکان یعنی کوئی کچا کچا گھر ایسا باقی نہ رہے گا کہ اللہ اس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ

فیکون الدین کلہ للہ
 کر دے، خواہ عزت والوں کی عزت و
 (السنن الکبریٰ ۳۰۵/۹) شوکت سے یا ذلت والوں کی ذلت و
 رسوائی سے۔

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد دنیا میں پورا دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے گا، یعنی نہ کوئی
 فرقہ رہے گا اور نہ کوئی ازم اور دھرم باقی رہے گا۔

پس ایسی نعمت کے نام سے آپ کیوں ڈرتے ہیں جو آئی ہی ہے دنیا سے فرقہ واریت کو
 نیست و نابود کرنے کے لئے، اور اس نے ماضی میں ایسا کر کے دکھلایا بھی ہے، اور مستقبل
 کے لئے اسی کی پیشین گوئی بھی کی ہے، جو یقیناً پوری ہو کر رہے گی؛ آپ کا دعویٰ اور مقصد بھی
 فرقہ واریت کو مٹانا ہے تو آپ اسلام کی تکذیب یا اس سے بے اعتنائی کر کے خود اپنی تکذیب
 کر رہے ہیں اور خود اپنے ہی کو بھولتے جا رہے ہیں، اس لئے اس سے گھبرانے کی ضرورت
 نہیں، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسلام فرقہ واریت کو ہوا تو کیا دیتا وہ تو آپ کی اس اصطلاحی جمہوریت اور عوامیت
 کی آخری حد کو بھی ناکافی جمہوریت بلکہ فرقہ واریت کہتا ہے؛ کیوں کہ اس کی جمہوریت ان
 بناوٹی جمہوریتوں سے کہیں زیادہ بلند اور بالاتر ہے؛ آپ کے یہاں تو فرقہ واریت صرف یہ
 ہے کہ مذہب کے نام پر کوئی سیاسی جماعت کھڑی ہو کر ایسی پارلیمنٹری سیاست لڑے جس
 سے ایک ملک کے مذہبی فرقوں میں کشیدگی اور کشمکش شروع ہو جائے؛ یہ رقابت اور پھوٹ
 آپ کے نزدیک ملک کے لئے مضر ہے۔

لیکن اسلام کہتا ہے کہ اگر آپ نے ملک کے نام پر تمام مذہبی فرقوں کو اپنے ملک میں
 جمع بھی کر لیا اور وہ کسی حد تک ہم آہنگ ہو بھی گئے تو بھی آپ اپنے مقصد میں ناکام ہیں، اس
 لئے کہ آج کل کے بین الاقوامی وسائلِ حیاۃ اور ہمہ گیر ایجادات و مصنوعات کے دور میں کسی
 بھی ملک کی سیاست محض داخلی اور مقامی معاملات کی حد تک نہیں رہ گئی ہے، بلکہ حنارجی

حکمتِ عملی اور بین الاقوامی سیاست سے وابستگی بھی لازمی ہے، تو ظاہر ہے کہ جب ہر ملک اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر دوسرے ملک سے معاملات کا تصفیہ چاہے گا تو لامحالہ دو ملکوں کے مفادات کسی نہ کسی مرحلے پر ٹکرائیں گے اور ان کے درمیان علاقائی یا وطنی رقابت پیدا ہو جائے گی، اور اس صورت میں مذہبی نہیں تو وطنی فرقہ واریت بہر حال نمایاں ہو جائے گی، اس طرح کشیدگی اور افتراق کا مسئلہ پھر بھی باقی رہ جائے گا۔

آج ہندو پاک میں کشمیر کا مسئلہ اور اس کی وجہ سے کشیدگی اور کشیدگی سے مختلف معاملات کی ناہمواری کون سے مذہب کے نام پر قائم ہے؟ ظاہر ہے کہ محض وطن کے نام اور جغرافیائی مفادات اور ملکی حد بندیوں کے نام پر قائم ہے؛ جس کے تحت ہزاروں انسانوں کی جانیں تلف اور کروڑوں روپیہ ضائع ہو چکنے کے باوجود ہنوز روزِ اول ہے یعنی معاملہ جوں کا توں ہے۔ چین اور امریکہ کی جنگ یا روس اور امریکہ کی کشیدگی جس کے تحت اربہا ربوں ڈالرز خرچ اور لاکھوں انسان لقمہ اجل ہو چکے ہیں کونسی فرقہ واریت کا نتیجہ ہے؟ یہ ترقی یافتہ ملک تو ملکی سیاست کے دائرے میں مذہب کا نام لینا بھی کفر سے کم نہیں سمجھتے، بلکہ محض وطنیت ہی کے بت کے سامنے سربہ سجود ہیں؛ تو پھر ان میں یہ فرقہ واریت کہاں سے آگئی؟

ظاہر ہے کہ اگر فرقہ واریت دو گروہوں یا دو قوموں کے ٹکرانے کا نام ہے اور آپ بہر صورت اس سے بچنا اپنا فریضہ خیال کرتے ہیں تو اس کا سبب خواہ مذہب بنے خواہ وطن یا کوئی اور چیز، بہر صورت اسے چھوڑ کر کسی ایسے معیار کو تلاش کرنا ہوگا جو اس فرقہ واریت سے دور رکھتے ہوئے آپ کو اتحاد کی طرف لے جائے؛ ورنہ پھر کہا جائے گا کہ آپ کو یہ دشمنی فرقہ واریت سے نہیں مذہب کے نام سے ہے۔ ہاں اگر کوئی مذہب ہی فرقہ واریت کی تعلیم دیتا ہو یا اس کی جمہوریت ہی میں فرقہ واریت گھسی ہوئی ہو اور تعصبات کو ابھار کر باہمی دشمنی پیدا کر دینا ہی اس کا نصب العین ہو یا کم از کم اس کا خاصہ ہو تو بلاشبہ ایسے مذہب کو سلام کئے جانے اور ترک کر دینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

بہر حال! آپ نے تو مذہبی فرقہ واریت کو ملک سے دور کرنے کے لئے وطن کے نام پر تمام مذہبی فرقوں کو جمع کر کے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اب ملک سے فرقہ واریت جاتی رہی، اور جمہوریت قائم ہو گئی لیکن اسلام نے اس جمہوریت کو بھی فرقہ واریت ہی بتلایا، کیوں کہ اب بھی وہی کشیدگی اور رقابت بدستور قائم ہے جس کی خاطر مذہب کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ ایک صوبہ میں نہ ہی چند صوبہ جات کے درمیان تو ہے، اسی طرح ایک ملک میں نہ ہی چند ممالک کے درمیان تو برقرار ہے؛ پس یہ فرقہ وارانہ کشیدگی کسی بھی نام سے ہو اور کسی بھی حصہ ملک یا حصہ دنیا میں ہو اپنے مہلک نتائج یقیناً اپنے ساتھ رکھتی ہے، اور بہر صورت اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے اسلام ایسی وطنی جمہوریت کو بھی فرقہ واریت ہی کہتا ہے، کیوں کہ نتیجے کے اعتبار سے یہ وطنی فرقہ واریت اس مذہبی فرقہ واریت سے کچھ کم نہیں ہے؛ نیز اس لئے بھی کہ اسلام کی دی ہوئی جمہوریت دنیا کی ان جمہوریتوں سے بہت بلند اور ہمہ گیر ہے، اس کا مقصد تو یہ ہے کہ دنیا میں سارے انسان بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں، نہ مذہبی فرقہ واریت رہے نہ وطنی فرقہ واریت، اور نہ ہی کسی اور قسم کی فرقہ واریت قائم رہے؛ پوری دنیا ایک ہی ملک اور ایک ہی فطری نظام پر آجائے۔ ارشاد بانی ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٢٨﴾
 وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسولوں کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے
 (سورۃ الفتح) اور اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے۔

پس آپ اسلام کے نام سے ڈریں نہیں، گھبرائیں نہیں؛ کیوں کہ اس کا نصب العین اس فرقہ واریت کو ہوا دینا نہیں جو انسانوں سے انسانوں کا ناحق خون کراتی ہے، بلکہ اس کا نصب العین فرقہ واریت کو مٹانا ہے؛ اور نہ صرف ایک ہی قسم کی فرقہ واریت کو مٹانا ہے بلکہ عادۃً دنیا میں جتنی نوع کی بھی مہلک و خطرناک فرقہ واریتیں ہو سکتی ہیں ان سب کو ختم کر کے

ایک ایسی عالمی جمہوریت کا فطری نظام قائم کرنا ہے جس میں ساری دنیا کے انسان مل جل کر بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں، سب کے سب ایک نظام میں منسلک ہوں، ان کی حکومت بھی عالمی ہو، وہ اقوام نہ ہوں بلکہ قوم واحد ہو جائیں، اور ان کے وطن کے ٹکڑے نہ ہونے پائیں۔

اسلام نے یہ دعویٰ کیوں کیا؟ کسی تعصب یا خوش اعتقادی کے طور پر نہیں بلکہ اپنے ایک اصول کے بل بوتے پر کیا، کیوں کہ اسی نے ایک ایسی عالم گیر برادری کا پتہ دیا جس میں تمام انسان انسانیت کی حیثیت سے بھائی بھائی ہو جاتے ہیں، اور یہ مصنوعی اور خود ساختہ اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے جو دنیا کو مختلف فرقوں میں بانٹے ہوئے ہے۔

انسانی مساوات اور اسلام

دنیا میں سب سے پہلی فرقہ واریت اور گروہ بندی نسبت یا نسبیت کے بل بوتے پر ہوتی ہے؛ ایک طبقہ اپنے کو سورج کی اولاد کہتا ہے اور دوسرے کو سیاہ توڑے کی، ایک اپنے کو خدا کے منہ سے نکلا ہوا بتلاتا ہے اور دوسرے کو پاؤں کے نیچے سے پیدا شدہ، اس لئے اپنے کو اونچ کہتا ہے اور دوسرے کو نیچے؛ اس کے پاس بیٹھنے سے عار کرتا ہے، اس کے ساتھ مل کر عبادت کرنے سے پرہیز کرتا ہے، اس کے ہاتھ سے کھانا گوارا نہیں کرتا، اس کے سائے سے بھی بھاگنا ضروری خیال کرتا ہے، نسبی شرکت یعنی رشتہ داری سے احتراز کرتا ہے؛ اور اس طرح دو قوموں میں اونچ نیچ سے پھر چھوت چھات پیدا ہو جاتی ہے؛ اور دو طبقے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا اور منقطع ہو جاتے ہیں؛ گویا کہ وہ دونوں ایک نوع کے افراد ہی نہیں تھے، بلکہ ایک نوع آسمانی تھی اور ایک زمینی؛ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر فرقہ واریت کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک انسانی طبقہ دوسرے انسانی طبقے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے اور انسانی برادری کے دو ٹکڑے کر کے رکھ دے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کسی منسلک، مذہب اور کسی ازم میں یہ اصول موجود ہوگا تو وہ جمہوریت تو کیا جمہوریت کے نام سے بھی

آشنا نہ ہو سکے گا؛ وہ ازم انسانوں کو ملائے گا تو کیا ہر وقت ان کے ٹکڑے کرتا رہے گا، جس سے جمہوریت کے بجائے انفرادیت بلکہ فرقہ واریت کے جراثیم ان میں پرورش پاتے رہیں گے۔ اسلام سے قبل یہ نسبی تفوق اور اونچ نیچ انسانوں کا ایک طبعی جذبہ تھا جو دنیا میں پھسل پھول رہا تھا اور دنیا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی؛ نہ اس وقت کے مذاہب اسے روک رہے تھے نہ قومیں اسے روک رہی تھیں، بلکہ اسکو اپنا پیدائشی حق سمجھے ہوئے تھے، ان حالات میں اچانک اسلام آیا اور اس نے اپنا پہلا اصول اسی نسبی فرقہ واریت کو مٹا کر نسبی یکسانی پیدا کرنا قرار دیا تاکہ دنیا کے انسان ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور ان میں ایک ہمہ گیر اشتراک عمل پیدا ہو جائے؛ چنانچہ اسلام نے اعلان کیا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ
ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۝
اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک
عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہارے
خاندان قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو
(الحجرات: ۱۳) پہچان سکو۔

ایک ماں باپ کی اولاد ہی کو بھائی بھائی کہا جاتا ہے اور ان بھائیوں کے درمیانی رشتہ کا نام اخوت اور برادری ہے؛ اسلام نے ساری دنیا کے انسانوں کو اسی رشتہ اخوت کا پابند اور اس سے جکڑا ہوا بتلایا، نہ کسی کو سورج کی اولاد کہا اور نہ کسی کو کالے توڑے کی، نہ کسی صنفِ انسانی کو خدا کے مونہ سے پیدا شدہ بتلایا اور نہ کسی کو پاؤں کا پامال کردہ؛ بلکہ سب کو ایک ماں باپ کی اولاد بتلا کر انہیں ایک دوسرے کا ایسا مساوی اور ہم مرتبہ قرار دیا جن کی انسانیت میں کوئی آپسی فرق اور اونچ نیچ نہیں۔

غور کیا جائے تو یہ اخوت و مساوات سے کہیں زیادہ اور اونچا مقام رکھتی ہے، کیوں کہ عرفی مساوات کے معنی قانون میں برابری کے ہیں، یعنی قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں، یہ ضروری نہیں کہ ان کی اپنی ذات میں بھی کوئی اونچ نیچ نہ ہو، بلکہ ذات پات کی اونچ نیچ

ہوتے ہوئے قانون کی مساوات نمایاں اور قابل تعریف مانی جاتی ہے؛ معلوم ہوا کہ مساوات سے انسانوں کی یکسانی ثابت نہیں ہوتی بلکہ قانون کی یکسانیت ثابت ہوتی ہے؛ اس کے برخلاف اخوة کے معنی ہی ذات کی برابری کے ہیں، کیوں کہ اخوت کہتے ہیں ایک اصل کی چند فروع کو جو ایک اصل میں شریک ہوں یا ایک ماں باپ کی اولاد سے ہوں؛ اور ظاہر ہے کہ جب تمام انسان ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ٹھہرے تو ان میں اونچ نیچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، اگر ان میں اونچ نیچ مانا جائے تو وہ ایک اصل کے فروع باقی نہیں رہ سکتے، پس اسی یکسانی، برابری اور ایک اصلی کا نام اخوت ہے، اور اسی کے معنی بھائی بھائی ہونے کے ہیں؛ پس قرآن نے اس آیت میں سارے انسانوں کو بھائی بھائی کہہ کر ایک عالم گیر برادری اور حقیقی مساوات کا سبق دنیا کو پڑھایا اور ان کے درمیان سے نفرت اور فرقہ واریت کی بنیاد اکھاڑ کر پھینک دی؛ کیوں کہ منافرت اور وحشت و جھنس یا دونوں کے افراد میں ہو سکتی ہے، ایک نوع کے افراد اور ایک اصل کی دو شاخوں میں وحشت و نفرت کے کوئی معنی ہی نہیں۔

پھر قرآن نے تو دنیا کے سارے انسانوں کو بھائی بھائی ہی بتلایا تھا جس سے ان سب کا ایک اصل ہونا واضح ہوا تھا، حدیث نبوی نے اور آگے بڑھ کر ان سارے انسانوں کو ایک جو بھی ثابت کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

کلکم بنو آدم و آدم من تراب تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو یعنی
(مجمع الزوائد: ۱۳۰۸۹) باپ شریک بھائی ہو، اور آدم مٹی سے
بنائے گئے ہیں یعنی تمہارا جوہر خلقت
ایک ہی ہے اور وہ مٹی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب مادہ خلقت سب اقوام کا ایک ہی ہو تو اقوام عالم میں باہمی منافرت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، نہ عقلی طور پر نہ طبعی اعتبار سے؛ نفرت اور دوری تو دور کی بات ہے انسیت و محبت اور ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس طبیعتوں میں پایا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو قومیں انسانوں کو ایک جوہر یا ایک اصل نہیں مانتیں وہ دنیا میں کبھی بھی حقیقی جمہوریت کی علم بردار نہیں ہو سکتیں؛ اس لئے کہ جن کے یہاں انسانوں کا کوئی طبقہ سورج کی اولاد ہو اور کوئی پیروں کی مٹی سے پیدا شدہ ہو ان کے یہاں اونچ نیچ ہی نہیں چھوت چھات بھی لازم ہوگی؛ جن کے یہاں گورے کو کالے پر پیدائشی برتری حاصل ہو اور رنگ روپ سے بھی فرق بن جاتے ہوں، جن کے یہاں انسانوں کی کوئی ایک اصل نہ ہو، بلکہ وہ کسی جنگل کے پودوں کی مانند زمین سے اگ آئے ہوں ان کے یہاں باہمی جذب و کشش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ اور جب ایسا ہوگا تو میل ملاپ یا اشتراک و یکسانیت اور مساوات کے پیرجنے ہی نہ پائیں گے پھر وہاں عالم گیر جمہوریت کا نام لینے کے کوئی معنی ہی نہ ہوں گے، اس کے باوجود جمہوریت کا نام لیا جائے گا تو وہ دنیا کو دھوکہ دینا ہوگا جو کبھی شرمندہ عمل نہ ہوگا۔

یورپ عالم گیر جمہوریت کا دعویدار ہے اور اس نے بلاشبہ تمدنی وسائل کو عالم گیر بنا ہی دیا ہے، مگر پھر بھی وہ عملاً اسے چلا نہیں سکا؛ کیوں کہ وہاں کالے گورے کا فرق اور خون اور نسب کی جوہری تفریق کا جذبہ موجود ہے، اور وہ کسی ایسے ازم اور مسلک پر اعتقاد نہیں رکھتا جو ان کی روحوں اور دلوں میں حقیقی عالم گیریت اور انسانی یکسانیت کا جذبہ پیدا کر دے؛ اس لئے اس کا دعویٰ جمہوریت محض سیاسی مفاد کی حد تک آ کر رک جاتا ہے، زبانوں پر رہنے کے باوجود حلق سے نیچے نہیں اترتا، ان کا عملی میدان کالوں کو اپنی سیاست پر نچپا نا اور دعویٰ جمہوریت کر کر کے انہیں نیچ اور غلام بنائے رکھنا، اور اپنے سیاسی منافع کے لئے ان کے جذبات سے کھیلنا بلکہ ان کی سکرات موت سے تفریح کرنا ہے، ایسی صورت میں ان سے کسی مخلصانہ عمل کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قوم کو بلا لحاظ رنگ و نسل حقوق انسانی فراہم کریں گے؟

اس کے برخلاف وہ ازم اور مسلک دنیا کے سارے انسانوں کو حقیقی مساوات کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر لاسکتا ہے جو انہیں ایک جوہر اور ایک ماں باپ کی اولاد بتلائے اور ان میں رشتہ یگانگت ہی نہیں رشتہ اخوت ثابت کر کے ان کے باہمی تفرقوں کو بالخصوص نسبی تفرقوں کو ختم کر دے جو انسانی جہالتوں کی ابتدائی پیداوار اور دنیا کی پہلی فرقہ واریت ہے، ایسا مذہب اسلام کے سوا ہمیں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

غور کیا جائے تو انسانوں میں یہ رشتہ یگانگت و اخوت قائم کر کے اسلام نے مذہب ہی کا نہیں انسانیت کا احترام بھی قائم کر دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسانوں کا کوئی طبقہ کسی حالت میں بھی ایسا ناپاک نہیں ہوتا کہ وہ تو وہ اس سے چھوٹی ہوئی چیز بھی نجس بن جائے؛ انسان انسان ہے اور انسانیت — یعنی یگانگت و محبت — اس سے کسی حالت میں دور نہیں ہو سکتی، اس کے افعال میں گندگی آسکتی ہے، اس کے خیالات ناپاک ہو سکتے ہیں مگر خود انسان اور انسانیت کا جوہر ناپاک نہیں ہو سکتا؛ انسان ہونے کی حیثیت سے بہر حال وہ واجب الاحترام ہی رہے گا، اس کی انسانیت کبھی گندہ نہ ہوگی۔

اسی لئے شریعت اسلام میں کسی انسان کا (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) ہاتھ لگا ہوا تو کیا ناپاک ہوتا اس کا پس خوردہ (جھوٹا) بھی ناپاک نہیں ہوتا، یہ وہی انسانی اخوت کی پاس داری اور نفس انسانیت کا احترام ہے، ورنہ اگر اس کی ہاتھ لگی خشک یا تر چیز اس کا پس خوردہ نجس ناپاک اور گھن کرنے کے قابل بن جائے تو یہ درحقیقت اس کے اصلی جوہر کی ناپاکی اور انسانیت کے گندہ ہو جانے کا دعویٰ ہوگا، جس سے پھر کوئی انسان بھی پاک نہیں رہ پائے گا، حالاں کہ یہ دنیا کی اقوام کے اجماع کے خلاف ہے، کوئی قوم بھی کلی طور پر تمام انسانوں کو ناپاک نہیں ٹھیرا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے حائضہ — یعنی ناپاک عورت — کو چھونے یا اس کا پس خوردہ استعمال کرنے یا اس کے ساتھ مل کر کھانے پینے کو منع نہیں کیا، کیوں کہ اس کی

یہ ناپاکی ایک حکمی ناپاکی ہے جو مخصوص عبادات سے روکتی ہے، عورت کو ذاتی طور پر ناپاک نہیں بنادیتی کہ اس کے سایہ سے بھی فرار اختیار کیا جائے؛ یا اس کا ٹھکانا، کھانا پینا سب الگ کر دیا جائے اور اسے ایک اچھوت کی حیثیت سے دوسرے انسانوں سے کاٹ دیا جائے، کیوں کہ یہ براہ راست انسانیت کی توہین ہے۔

غور کیجئے کہ جو مذہب اپنے ابتدائی اصولوں میں سب اقوام عالم کو اصل کے اعتبار سے پاک بتلائے، سب کو ایک جوہر کہے، سب میں برادری اور اخوت کا رشتہ ثابت کرے، اور مصنوعی اونچ نیچ ختم کر کے ان میں یکسانی اور برابری ثابت کرے، ان میں سے چھوت چھات مٹا کر باہمی میل جول اور معاملات کے راستے ہموار کرے وہ مذہب اقوام عالم کو جوڑنے والا مذہب ہو سکتا ہے یا وہ مذہب جو ان میں چھوت چھات اونچ نیچ اور نابرابری کا قائل ہو؟

پس جب بھی دنیا بین الاقوامیت کی طرف آئے گی اور جب بھی وہ عالمی رشتہ اور عالمی یگانگت کا نصب العین لے کر کھڑی ہوگی تو اس کے لئے چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ اسلام کے اصول یک جوہریت اور یک اصلیت کو مانے اور اس کے ذریعہ سے اقوام کے درمیان نفرت باہمی اور اونچ نیچ کا خاتمہ کرے؛ ورنہ بین الاقوامیت تو کیا قائم ہوگی یک قومیت کی سطح بھی ہموار نہیں رہ سکے گی، ایک ہی قوم میں اتنے تفرقے اور اتنی نفرتیں قائم ہو جائیں گی کہ ان کا ایک پلیٹ فارم، ایک عبادت گاہ، ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ میں جمع ہونا تک محال ہو جائے گا، جیسا کہ اس قسم کی تنگ اقوام میں آج بھی اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

گاندھی جی نے اس حقیقت کو سمجھا اور انہوں نے ہندوستان کی نجات بالآخر اسی میں سمجھی کہ اپنی قوم میں سے اس اونچ نیچ اور چھوت چھات کا خاتمہ کریں؛ وہ اس جذبہ کے ماتحت صرف کہتے اور لکھتے ہی نہ تھے بلکہ عمل بھی کر کے دکھاتے تھے؛ دہلی جا کر اگر ٹھہرتے تھے تو بھنگی بستی میں ٹھہرتے تھے تاکہ ”ہریجنوں“ میں سے احساس کمتری نکال ڈالیں اور

اونچی ذات والوں کے دلوں سے احساس برتری کا خاتمہ کر دیں، اس طرح مساوات کی بنیاد قائم ہو جائے؛ آج ”پنڈت جواہر لال نہرو“ وزیر اعظم ہند نعرہ لگا رہے ہیں کہ یا تو دنیا کو عالمی حکومت قائم کر لینی چاہئے یا پھر خود کشی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ دنیا نسلی امتیازات اور شہنشاہیت اور سرمایہ داری کو ختم کرے؛ کیوں کہ نسلی امتیازات میں نسبی اونچ نیچ ہے، ملوکیت میں سیاسی اونچ نیچ ہے، اور سرمایہ داری میں مالی اونچ نیچ ہے، جب کہ اونچ نیچ کبھی بھی آپسی بھائی چارہ اور محبت کو برداشت نہیں کر سکتی۔

ہمیں خوشی ہے کہ آج ہر تعلیم یافتہ اور سمجھ دار آدمی خواہ وہ کسی قوم کا بھی ہو ہمہ گیری اور عالم گیری کی طرف آرہا ہے، اور اس کے لئے ہر نوع کی اونچ نیچ کو ختم کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے، جو اسلام کی خاص تعلیم ہے، اور وہی دنیا میں سب سے پہلے اس اخوت و مساوات اور یک اصلی اور یک جوہری کو لے کر آیا ہے۔

اس اونچ نیچ کے خاتمے پر بھی اگر فرقہ واریت اور باہمی کشیدگی نظر آتی ہے تو وہ مذہبی راستوں سے آرہی ہے اور اسی لئے آج کی دنیا مذہب کو سیاست سے ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کا یہ فعل معقول اور لائق تحسین ہے مگر ان ہی مذاہب کی حد تک جو ان کشیدگیوں اور طرح طرح کی فرقہ واریتوں کی تعلیم دیں یا اس کے ذمہ دار ہوں؛ اور جو مذہب بنیادی اور اصولی طور پر آیا ہی ہو فرقہ واریت ختم کرنے اور رنگ و روپ، نسب و نسل، دولت و مال اور منصب و وقار کے تفرقے مٹانے کے لئے، اور اس نے دنیا کے سامنے اصول و ضوابط ہی کچھ ایسے رکھے ہوں جن کے ہوتے ہوئے فرقہ واریت وجود ہی میں نہ آسکے تو اس مذہب کا کیا تصور ہے کہ اسے بھی ملک و ملت اور ان کے معاملات سے خارج کیا جائے؟ اور اگر آپ اسے خارج کرتے بھی ہیں تو وہ خارج کیسے ہو جائے گا؟ اس لئے کہ آپ فرقہ واریت مٹانے کے لئے جو اصول بھی اختیار کریں گے وہ اصول اسی کا تو ہوگا، اس

لئے آپ اس کا انکار کر کے بھی اقرار کریں گے، اور اسے رد کر کے بھی قبول کرنے پر مجبور ہوں گے۔

اگر آپ اونچے اونچے مٹا دیں گے تو گویا آپ نے عقیدۂ یا عملاً اسلام کی اس تعلیم کو مقبول کر لیا، اور اگر آپ اخوت و مساوات کا اصول لانا چاہتے ہیں تو گویا آپ دل و جان سے اسلام سے موافقت کر رہے ہیں، یہ اور بات ہے کہ زبان سے مخالفت کر رہے ہیں جو دل سے الگ ہو کر بول رہی ہے، اور جب زبان دل کی ترجمان نہ ہو تو اس کا کیا اعتبار ہے؟ قول محض جس کے ساتھ نہ عقیدہ ہو نہ عمل وہ کیا وقعت رکھتا ہے کہ اسے مانا جائے؟۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اسلام کا نام لینے سے تو ڈرتے ہیں لیکن اس کا کام کرنے سے اور اس کو ماننے سے نہیں بچ سکتے؛ پھر ایسی چیز سے بھاگنے اور ڈرنے سے کیا حاصل ہے جو آپ کا پیچھا نہ چھوڑے اور آپ کہیں بھی بھاگ کر جائیں وہ آپ کو وہیں جا پکڑے، اس لئے کیا اچھا ہوتا کہ آپ زبان سے بھی ایسی واقعی چیز کا نام لینے سے گھبرانا چھوڑ دیں جو آپ کے دلوں اور روحوں میں گھس چکی ہے اور آپ خواہی نہ خواہی اس کے محتاج ہیں۔

قانونی فرقہ واریت اور اسلام

انسانوں میں انسانی برابری اور یک جہتی کے بعد اگر تفرقہ پھیل سکتا ہے تو وہ قانونی تفاوت سے پھیل سکتا ہے، مثلاً ایک قوم کے افراد کو ایک عبادت گاہ میں برابری کے ساتھ جمع ہونے کا حق نہ ہو، یا قومی قانون کی کتاب کو پڑھنے کا یکساں حق نہ ہو، یکساں سننے کا حق نہ ہو، عبادت گاہیں مخصوص خاندانوں کا حق قرار دے دی جائیں، تعلیم گاہیں مخصوص خاندانوں کی ملکیت ہوں، علم مخصوص قبائل کا ورثہ ہو جس سے ہر ایک کو مساویانہ انداز سے استفادہ کا حق نہ ہو، دسترخوان اور اس کے ظروف عوام و خواص کو یک جا اور اکٹھا نہ کر سکیں، کچھ لوگ آئینی طور پر شدہ ہوں اور کچھ ملتے ہوں تو یقیناً ایسی قوم تفرقے کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

زمانہ جاہلیت میں مشرکین عرب میں جہاں نسلی اور نسی امتیاز است تھے وہیں عباداتی

امتيازات بھی تھے، حج کے موقع پر عام لوگ تو عرفات میں وقوف اور قیام کرتے تھے لیکن اشراف عرب کا رتبہ اس سے بالاتر تھا، وہ صرف منی تک پہنچ کر رک جاتے تھے، ان کی امتیازی شان عوام الناس کی برابری یا ان کے دوش بہ دوش عبادت گزاری برداشت نہیں کر سکتی تھی؛ گویا قانون مذہب ہی نے ان کو یہ امتیازی حق دے کر انہیں اونچے اور دوسروں کو نیچے بنا دیا تھا یا جیسے نصاریٰ کے یہاں پاپائیت کے اقتدار کے دور میں حدود اور تعزیرات چھوٹے لوگوں پر تو جاری کی جاتی تھیں لیکن بڑے لوگ قانون کی گرفت سے مستثنیٰ رکھے جاتے تھے؛ گویا وہ قانون کی رو سے اونچے تھے اور دوسرے نیچے۔ کسی قوم میں ایک طبقہ روپیہ کمانے کے لئے مخصوص تھا اور ایک طبقہ اس سے محروم ہو کر ذلیل خدمات کے لئے وقف تھا؛ گویا ایک سرمایہ دار بننے کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے اور ایک ہمیشہ نادار رہنے کے لئے؛ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان اقوام میں باہم شدید نفرت تھی، ظلم و تحقیر کے دروازے کھلے ہوئے تھے خانہ جنگی کے جراثیم رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے، جس سے ایک طبقہ دوسرے طبقے سے کسی بھی وقت مامون اور مطمئن نہ رہ سکتا تھا؛ ایک طبقے کی زندگی اس طرح اجیرن تھی گویا کہ وہ پیدا ہی اس پستی و ذلت کے لئے کیا گیا ہے؛ اور ایک طبقہ اس قدر مگن اور مطمئن تھا گویا وہ پیدا ہی موج و مستی کے لئے ہوا ہے۔

اسلام نے اُس فرقہ واریت کو بھی نیست و نابود کرنے کا پیغام دنیا کو دیا جو قانونی اونچے نیچے سے پیدا ہوتی ہے، مثلاً اس نے کہا کہ علم کسی ایک خاندان کی میراث نہیں بلکہ بلا تفریق خاندان و نسل ضروریات دین کی حد تک علم کا طلب کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے اور اس سے زیادہ اگرچہ فرض کفایہ ہے مگر جو چاہے حاصل کر سکتا ہے؛ عبادت گاہوں میں محمود و ایاز برابر ہیں، مسجد کی صفوں میں صدیق اکبر اور ایک حبشی عیلام یکساں ہیں، حدود و قصاص اور تعزیرات میں ایک عام آدمی اور مسلمانوں کے امام (ﷺ) کی سیٹی برابر ہیں، اگر خدا نخواستہ پیغمبر کی بیٹی چوری کر بیٹھے تو اس کے ہاتھ بھی عوام کی طرح کاٹے جانے ضروری

ہیں؛ حج میں دو کپڑے کا احرام شاہ و گدا کے لئے برابر ہے، خواہ عامی ہو یا بادشاہ وقت دونوں کے لئے عرفات جانا بھی ناگزیر ہے، مالِ غنیمت سے اگر ایک چادر کسی عامی کا حق ہے تو اتنا ہی امیر المؤمنین کا بھی حق ہے، ذرا سے شبہ پر بھی ایک دیہاتی فاروقِ اعظم پر اعتراض کر سکتا ہے، غرض یہ کہ قانونِ اسلام کی نگاہ میں سب کے حقوق برابر ہیں؛ بہر حال فرقہ واریت اور قومی تفریق کی ایک بنیادیں اور نسلی امتیاز تھا تو اسے بھی اسلام نے ختم کر دیا اور ایک دوسری وجہ قانونی امتیاز تھا تو اس کی بھی اسلام نے بیخ کنی کر دی۔

اوپر مذکور آیت کے پہلے جملہ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰی سے تونسلی اونچ نیچ کو مٹا دیا جس کے معنی اخوت کے ہیں کہ سب انسان انسان ہونے میں برابر ہیں اور بھائی بھائی ہیں، اور دوسرے جملہ اِنَّ اَكْثَرَ مَا كُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰی كُمْ سے قانونی امتیازات کو ختم کر دیا، جس کے معنی مساوات کے ہیں؛ یعنی جو اس قانونِ تقویٰ و دین پر زیادہ چلے گا وہی عند اللہ بڑا ہوگا، جس کا حاصل سب کے لئے قانون کی یکساں پابندی اور سب پر قانون کا یکساں حکم راہ ہونا ہے؛ پس نسبی برتری تو اخوت سے ختم ہو جاتی ہے اور قانونی برتری مساوات سے جاتی رہتی ہے، یہ اخوت و مساوات انسانی مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی کا خاص اصول ہے جو اس نے اونچ نیچ میں پھنسی ہوئی اقوام کے سامنے پیش کیا ہے۔

تعظیمی فرقہ واریت اور اسلام

فرقہ واریت کی ایک تیسری خطرناک نوع اعتقادی اور تعظیمی اونچ نیچ ہے، یعنی اپنے کسی مقتدا یا بزرگ ترین شخصیت کی اس انداز سے تعریف و توصیف کی جائے کہ دوسروں کے مقتداؤں کی تنقیص یا توہین لازم آجائے، یا تقابل کے ذریعہ ایک مقتدا کو اس طرح بڑھایا جائے جس سے دوسرا گھٹیا محسوس ہونے لگے؛ یقیناً یہ طرزِ عمل باہمی منافرت اور عداوت و کشیدگی کے پیدا ہونے اور بڑھنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے جو آپس کی دشمنیوں کا بیج بوتا ہے؛ اس طرزِ عمل کے برخلاف دوسری اقوام کے مقتداؤں کو بھی بڑا ماننا اور ان کی بزرگی کو

تسلیم کرنا خواہ متعین طور پر یا عمومی انداز سے بلاشبہ باہمی موانست اور آپسی محبت کا موثر ذریعہ ہے؛ اسلام نے اس اعتقادی فرقہ واریت کو مٹا کر رسولوں، نبیوں اور پیغمبروں کے بارے میں اعتقادی مساوات کا اصول بتلایا اور اعلان کیا کہ:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ہم اس کے پیغمبروں کے درمیان کوئی
(البقرة: ۲۸۵) تفریق نہیں کرتے

ایمانی مساوات کا اصول دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے فرمایا:

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور
وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَّا نُفَرِّقُ اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر
وَالْأَسْبَاطَ ۚ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ بھی جو ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق اور
النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَّا نُفَرِّقُ یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف بھیجا گیا،
بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اور
مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۶﴾ اس پر بھی جو ان کے رب کی طرف سے
(البقرة) اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا اس
کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک
میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ
کے فرماں بردار ہیں۔

رسولوں کے بارے میں فرمایا کہ بعض کا نام لے کر ہم نے تذکرہ کیا ہے اور بعض کا نام بنام تذکرہ نہیں کیا، یعنی وہ لفظ انبیاء کے ذیل میں آجاتے ہیں اس لئے نامزد اور غیر نام زد تمام انبیاء ہمارے اعتقاد کے دائرے میں داخل ہیں جن کی توہین تو کیا کی جاسکتی ہے ادنیٰ تنقیص تک ہم برداشت نہیں کر سکتے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا:

لاتطرونی کما اطرت النصارى میری تعریف میں مبالغے مت کرو جیسے
 المسيح بن مریم نصاری نے حضرت مسیح کی تعریف میں
 (بخاری: ۴۸۶۶) مبالغے کئے (کہ انہیں خدا اور خدا کا بیٹا
 تک کہ ڈالا)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:
 مَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَقُولَ أَنَا خَيْرٌ مِنْ تَمَّ مِنْ سَيِّئَةٍ لَمْ يَنْبَغِ لِي أَنْ أَقُولَ
 يُوُسُ بْنُ مَتَّى یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔
 (بخاری: ۳۶۰۳)

یعنی تقابل کرتے ہوئے دوسرے انبیاء کے مقابلے میں میری تعریفیں کرتے مت
 پھر وہ، کیوں کہ اس کا قدرتی نتیجہ دوسروں کی تنقیص اور توہین کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔
 پھر جن مقتداؤں کو دنیا کی قوموں نے اپنی عقل سے معبود ٹھہرا لیا اور خدا کے سوا انہیں
 پکارنے اور ان کی پوجا کرنے لگے تم ان کو بھی برا نہ کہو کہ کہیں وہ جواب اور مستابلے میں
 تمہارے بزرگوں اور مقتداؤں کو ناحق طور پر برا نہ کہ بیٹھیں کہ اس صورت میں تم خود ہی اپنے
 مقتداؤں کو برا بھلا کہلوانے کے ذمہ دار قرار پاؤ گے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ
 یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے
 ہیں ان کو برا بھلا مت کہو، کیوں کہ پھر وہ
 جہل و دشمنی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی شان
 (سورۃ الانعام: ۱۰۸) میں گستاخی کریں گے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے اپنی بعض تحریروں میں فرمایا
 ہے کہ ہندو قوم کے بڑوں — جیسے رام چندر اور سری کرشن وغیرہ — کو بھی نام لے کر
 برا نہ کہو، کوئی تو بین آمیز کلمہ ان کی شان میں زبان سے مت نکالو، کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے

وقت میں یہی لوگ وہ مردان حق ہوں جو بطور ہادی اور نذیر کے بھیجے گئے ہوں، ہو سکتا ہے یہی لوگ حق کا پیغام لے کر ہندوستان کی اصلاح کے لئے آئے ہوں، اور ہوتے ہوتے بعد کے لوگوں نے ان کی تعلیمات حق مسخ کر دی ہوں، جیسا کہ اہل تورات اور اہل انجیل نے اپنی ان آسمانی کتابوں کا حشر کر دیا ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیا؛ اگر یہ لوگ اللہ کے نزدیک سچے ہادی و نذیر تھے تو وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ يَنْقُصْ عَلَيْكَ (اور بعض پیغمبر وہ بھی ہیں جن کا تذکرہ ہم نے تم سے نہیں کیا) میں داخل ہو کر واجب الاحترام ہوں گے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے بعض فَمِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ (اور ان میں سے وہ پیغمبر بھی ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر کیا ہے) میں ہی داخل ہوں اور ان کے ناموں سے انہیں قرآن وحدیث میں یاد کیا گیا ہو لیکن لغت کے فرق سے ناموں کے تلفظ میں فرق ہو جانے کی وجہ سے ہم بآسانی ان عجمی ناموں کو نہ سمجھ پاتے ہوں؛ جیسے ”یوسف“ جو عربی میں مستعمل ہے اسے انگریزی تلفظ میں ”جوزف“ بولتے ہیں، یا ”یعقوب“ کو انگریزی میں ”جیکب“ کہا جاتا ہے؛ یا جیسے حضور ﷺ کا اسم مبارک ”احمد“ اپنے ترجمہ کے لحاظ سے انجیل کی عبرانی زبان میں ”فارقلیط“ ہے، یا جیسے ہندو شاستروں میں جس عظیم الشان اوتار کے آنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس کا نام ”مہامت“ لکھا ہے جو لفظ اور ترجمہ کے لحاظ سے ”محمد“ سے قریب ترین ہے، اور ان کی والدہ کا نام ”سوامتی“ لکھا ہے جس کا ترجمہ امن والی یعنی آمنہ اور باپ کا نام ”ایشور داس“ لکھا ہے جس کا ترجمہ ہے بندہ خدا یعنی ”عبداللہ“؛ یا جیسے ”عیسیٰ“ عربی کا لفظ ہے اور انجیل میں اس کو ”الیسوع“ بولا گیا ہے، یا جیسے ہمارے محترم بزرگ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ”النبی الخاتم“ میں تحریر فرمایا ہے کہ آج ہندوستان میں حفریات (excavations) اور آثارِ قدیمہ کے سلسلے میں کھدائی کرتے ہوئے جو ہزار ہا برس کا دبا دبا یا شہر ”کیل“ نکلا ہے تو ممکن ہے کہ یہ ”کیل“ وہی پیغمبر ہوں جن کو قرآن میں ”ذوالکفل“ کہا ہے، کیوں کہ ”کفل“ اور ”کیل“ میں کوئی خاص فرق نہیں؛ اسی

طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے یہ مقتدا اور بزرگ اس وقت کی ہندی یا سنسکرت زبان میں جن معروف ناموں سے موسوم ہوں قرآن وحدیث میں ان اسماء کو عربی حروف اور لہجے میں تلفظ کیا گیا ہو؛ — جیسے کپل اور ذوالکفل — تو اس صورت میں تو ان لوگوں کا نام لے کر کوئی ادنیٰ توہین یا گستاخی کرنا لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ کی صریح خلاف ورزی ہو جائے گی۔ اَعَاذُنا اللہ منہ

بہر حال! اس آیت سے قرآن حکیم نے ایک ضابطہ ارشاد فرما دیا کہ دوسری اقوام کے بزرگوں اور مقتداؤں کی توہین مت کرو اور ان کا ہادیٰ برحق ہونا معلوم ہو جانے کے بعد تو نام بہ نام ان پر ایمان لاؤ اور اپنے اپنے وقت میں انہیں ہادیٰ برحق جانو؛ اور اگر سندنہ ہونے کی وجہ سے تعین نہ ہو سکے تو اجمالاً انہیں مانو، اور کسی قسم کی سندنہ ہو تو پھر بھی مشخص کر کے کسی کے نام کے ساتھ کوئی نامناسب کلمہ استعمال مت کرو، بلکہ یوں کہہ دو لا نصدقہم و لا نکذبہم یعنی نہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب کرتے ہیں، بلکہ معاملہ خدا کے حوالے کرتے ہیں؛ ظاہر ہے کہ اقوام عالم کو اپنے سے قریب تر کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا منصفانہ اور خیر خواہانہ اصول ہو سکتا ہے کہ جس سے ایک قوم دوسری قوم کی ہمدرد اور مخلص بنائی جاسکتی ہے؛ پس اسلام نے اس اصول کے ذریعہ تعظیمی و توصیفی فرقہ واریت کو بھی بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور اس میں بھی مساوات کا اصول مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا۔

وطنی فرقہ واریت اور اسلام

تفریق اقوام کا ایک طبعی اصول وطنی فرقہ واریت ہے، حد بندیوں سے تو صرف زمین کے ہی ٹکڑے ہوتے ہیں جو کچھ زیادہ برے نہیں، لیکن ان ٹکڑوں پر اس انداز سے فخر کرنا کہ دوسرے قطعات زمین ناقابل فخر یا ناقابل ذکر سمجھ لئے جائیں اور ایک حصہ زمین دوسرے حصہ زمین کی توہین اور برائی کا ذریعہ بن جائے تو اس سے لوگوں کے دل ٹوٹنے لگتے ہیں، اور وطنی تعصبات پیدا ہو کر قومی تعصبات کا راستہ ہموار کر دیتے ہیں، یہیں سے وطنی فرقہ واریت کا

ظہور ہوتا ہے جو اقوام کو آپس میں لڑا دیتا ہے؛ پس زمین کی تقسیم تو بری نہیں مگر اس سے دلوں کی تقسیم کا پیدا ہونا حد درجہ بری چیز ہے، کیوں کہ دل بگڑتے ہی اقوام میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے؛ کسی کے وطن کو اگر گالی دی جائے تو وہ جواب میں گالی دینے والے کے وطن ہی کو نہیں وطن کے باشندوں تک کو گالی دینے لگتا ہے، جس سے ایک زبردست نزاع و اختلاف کی داغ بیل پڑ جاتی ہے؛ اس کے برعکس اگر کسی کے وطن کی تعریف کر دی جائے، اسے سراہا جائے تو اس وطن کے باشندوں کا دل مٹھی میں آ جائے گا، پھر اگر یہ تعریف و توصیف مذہبی اور شرعی طور پر ہو تو پھر کیا ہی کہنا، ایسی صورت میں اہل وطن اس مذہب کے گرویدہ ہو جائیں گے۔

اسلام کا یہ ایک مستقل اصول ہے کہ جس وطن میں جو مذہبی اور شرعی خصوصیت یا منقبت ہو اسے برملا بیان کیا جائے، اس لئے نہیں کہ باشندگانِ وطن پر اچھا اثر پڑے کیوں کہ یہ اثر تو بطور خاصیت کے خود ہی ظاہر ہوگا، اس لئے اس نیت سے اس کی تعریف کرنا فضول ہے؛ اس کے بجائے اس نیت سے تعریف کرنی چاہئے کہ ایک اچھا وطن اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اسے اچھا کہا جائے، کیوں کہ جو اس کی واقعی خوبی ہے — خواہ تمدنی ہو یا دینی — اس کا اعتراف کرنا انصاف کا تقاضہ ہے؛ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے جس انداز سے جواز اور سرزمینِ عرب کی تعریف کی ہے اسی انداز سے دوسرے ممالک کی بھی ایسی باتوں کی تعریف کی ہے جو ان میں من جانب اللہ ودیعت کی گئی ہیں؛ اسلام میں فضائل کا ایک عظیم الشان باب ہے جو وطنوں، مکانوں اور مواضع و مقامات ہی کے لئے خاص طور سے رکھا گیا ہے؛ چنانچہ ججاز اور مکہ مدینہ کی تقدیس کی طرح اس نے شام کی، دمشق کی، یمن کی، حبش کی، خراسان کی، عراق کی، مصر کی، اسی طرح مخصوص پہاڑوں کی مخصوص مقامات کی تعریف کی ہے؛ کتبِ احادیث ان فضائل سے بھری ہوئی ہیں؛ اسی طرح ہندوستان کے فضائل بھی ذخیرۂ احادیث میں موجود ہیں۔

ذرا غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کا پہلا دار الخلافۃ جس میں اولین خلیفہ خداوندی سیدنا آدم علیہ السلام

نازل ہوئے وہ ہندوستان ہی تو ہے؛ کیوں کہ آدم ﷺ جنت سے ”سراندیپ“ کے جزیرے میں ایک وادی کے اندر اترے ہیں، جو پہلے ہندوستان ہی میں تھا؛ چنانچہ ابن جریر، ابن حاتم اور حاکم رحمہم اللہ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے کہ:

اول ما اهبط الله آدم الى ارض
الهند وفي لفظ بوجنی ارض
الهند (سبحه المرجان)
سب سے پہلے اللہ نے آدم کو سرزمین
ہند میں اتارا اور ایک روایت میں ہے
وجنی میں اتارا جو سرزمین ہند میں ہے۔

ابن عباسؓ ہی کی دوسری روایت میں ”سراندیپ“ کا لفظ بھی موجود ہے؛ اس وادی کی فضیلت میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

خير واد في الناس وادی مکه و
واذنزل به آدم بارض الهند
لوگوں میں سب سے بہترین وادی وادی
مکہ ہے اور سرزمین ہند کی وہ وادی جس
میں آدم ﷺ اترے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آدم ﷺ نے اول ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنایا، گویا دنیا کی پہلی آبادی ہندوستان ہی سے شروع ہوئی؛ آدم ﷺ سب سے پہلے نبی ہیں، اس لئے پہلا دارالنبوۃ بھی ہندوستان قرار پاتا ہے جیسا کہ آخری دارالنبوۃ حجاز ہے؛ ظاہر ہے کہ پہلے کو آخر سے ایک خاص نسبت ہوتی ہے۔

جنت سے دو ہی انسان زمین پر اترے ہیں، ایک آدم ﷺ جو ہندوستان میں اترے، دوسرے ان کی زوجہ حوا علیہا السلام جو سرزمین حجاز میں اتریں؛ اللہ تعالیٰ کا پہلا قانون ہدایت ہندوستان ہی میں آیا اور یہیں سے وہ دین شروع ہوا جس کی تکمیل بالآخر حجاز میں ہوئی؛ جبرئیل امین وحی لے کر سب سے پہلے ہندوستان ہی میں اترے، پہلی اذان ہندوستان میں

ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا اعلان ہوا، جیسا کہ روایت میں موجود ہے؛ پہلے نبی کو آخری نبی کے آنے کی بشارت ہند ہی میں دی گئی؛ طبری کی روایت میں ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام اپنی زوجہ حوا علیہا السلام کو لے کر حجاز سے لوٹے تو اسی وادی میں آئے جس میں نزول ہوا تھا اور وہیں رہنے کے لئے گھر بنایا، یعنی ہندوستان پہلے نبی کا وطن ہے، و کفی بہ فخراً

آدم علیہ السلام کی قبر بھی وجنی (سراندیپ) ہی میں ہے اور حدیث سے ثابت ہے کہ آدمی کی قبر اسی جگہ بنتی ہے جہاں کی مٹی سے اس کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ خاکِ پاک ہند ہی نے پیغمبری کی بنیاد رکھی؛ آدم علیہ السلام نے چالیس حج کئے اور ایک حج کے لئے تو بیل پر سوار ہو کر گئے ہیں، جیسا کہ ایک روایت میں نقل ہوا ہے، نیز کھیتی باڑی کے لئے آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سرخ رنگ کا بیل اور گائے ہی عنایت فرمایا تھا؛ گویا بیل کی نسل ہند ہی سے شروع ہوئی ہے؛ شاید اسی لئے ہندوستان میں اس جانور کی عظمت زیادہ کی جاتی ہے کہ یہ پہلا جانور ہے اور اسے پہلے پیغمبر سے ایک خاص نسبت بھی حاصل ہے؛ (حضرت ادریس علیہ السلام کی بعثت بھی ہندوستان میں ہوئی) انبیاء علیہم السلام میں فہم ادریس معروف ہے گویا فہم کی تیزی حضرت ادریس علیہ السلام کا ممتاز وصف ہے اس لئے ان پر علومِ حکمت خصوصیت سے اتارے گئے تھے۔

پس اگر حجاز اس لئے مقدس ہے کہ آخری نبی کا مولد و منشا اور وحی قرآنی کے نزول کی جگہ ہے، اور اگر شام اس لئے مقدس ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کا مولد و منشا ہے، اور اگر مصر اس لئے مقدس ہے کہ اسے موسیٰ علیہ السلام سے نسبت حاصل ہے، اور اگر عراق اس لئے مقدس ہے کہ اسے ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہے تو بلاشبہ ہندوستان اس لئے مقدس ہے کہ اسے آدم علیہ السلام سے نسبت ہے، پہلی وحی کا مہبط ہے، نبوت کی پہلی تعلیم گاہ ہے، اور پہلا دار الخلافہ ہے، اور اس لئے بھی مقدس ہے کہ طبرانی کی روایت کے مطابق وہ حضرت شیث علیہ السلام کا وطن ہے جو آدم علیہ السلام کے جلیل القدر بیٹے اور ان کے خلیفہ تھے، انہوں نے ہی آدم علیہ السلام کے جنازے

کی نماز پڑھائی ہے، اور اس لئے مقدس ہے کہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق وہ نوح علیہ السلام کا وطن ہے؛ سینکڑوں اہل اللہ کے مکاشفات بھی ہیں جس سے ہندوستان کی سرزمین میں مختلف انبیاء کی قبروں اور آثار ہونے کا انکشاف ہوا ہے۔

اس طرح ہندوستان کے شرعی فضائل سے اس کی تقدیس ثابت ہوتی ہے، پس اگر وہ ہندوؤں کے نزدیک مقدس سرزمین ہے تو مسلمان بھی اس کے تقدس کو ماننے میں ان سے کچھ کم نہیں ہیں؛ فرق اتنا ہے کہ وہ بلا سند محض سنے سنائے قصے کہانیوں پر اس کو مقدس مانتے ہیں اور مسلمان سند اور ثبوت کے ساتھ اور بھروسہ مند تاریخی حوالوں سے اس کی تقدیس کے قائل ہیں۔

پھر جس طرح قرآن حکیم نے چند مخصوص و معروف انبیاء علیہم السلام کا ذکر تو نام بہ نام کیا جن کی قومیں دنیا کی مستقل امتیں تھیں، اور اکثر و بیشتر انبیاء کو صرف عموم ذکر کے دائرے میں چھوڑ کر اعلان کر دیا کہ ”لَا نَفَرٌ قُبُورٍ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ رُسُلُهُ“ ہم رسولوں میں سے کسی میں بھی فرق نہیں کرتے، ہمارے نزدیک سب انبیاء قابل احترام اور لائق ایمان ہیں، اسی طرح وطنوں کے سلسلے میں بھی۔ مخصوص ممالک کا جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے معروف اور قوموں میں متعارف تھے نام بہ نام تذکرہ کیا اور ان کے فضائل بیان کر کے انبیاء کی نسبتوں سے ان کی تقدیس ظاہر کی، جیسے مصر، شام، عراق، یمن، حجاز اور ہندوستان وغیرہ؛ اور دنیا کے بقیہ ممالک کی تقدیس نبیوں ہی کی نسبت سے ان کے نام ذکر کئے بغیر فرمائی کہ:

وَإِنَّ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿۳۴﴾ اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی

(سورۃ الفاطر) ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۳۵﴾ (سورۃ الرعد) اور ہر قوم کے لئے ہادی ہوتے تھے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ
رَسُولًا ﴿١٥﴾ (سورۃ الاسراء)
اور ہم اس وقت تک کسی قوم کو سزا نہیں
دیتے جب تک ان میں کسی رسول کو بھیج
نہیں دیتے۔

جس سے واضح ہے کہ کوئی امت اور کوئی قوم خواہ وہ کسی خطہ زمین کی بسنے والی ہو
بلا ہادی اور نذیر کے نہیں چھوڑی گئی، گویا ہر خطہ زمین اور ہر کٹڑہ وطن میں انبیاء آئے ہیں؛ اور
ظاہر ہے کہ انبیاء اور اہل اللہ ہی کی نسبت سے زمینی علاقوں کی تقدیس ہوتی ہے، تو اس عموم
سے عامۃً ہر ملک اور ہر وطن کی تقدیس پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک عام ہدایت نکل آتی ہے کہ
کسی بھی خطہ زمین کو زمین کی حیثیت سے برا نہ کہا جائے؛ جب ایسی بات ہے کہ کوئی قوم کسی
وطن کو بھی برائی سے یاد نہ کرے تو اس سے وہ وطنی عصبیت اور وطنی منافرت کا سلسلہ بھی ختم
ہو جاتا ہے؛ جس سے اقوام میں وطنی فرقہ واریت اور کشیدگی قائم ہوتی ہے؛ ہاں یہ ہو سکتا ہے
کہ کسی خطہ زمین اور قطعہ وطن کے افراد پر کسی وجہ سے نکتہ چینی کی جائے، کیوں کہ اس سے
وہاں کے بسنے والوں کو تنبیہ کرنا اور جھنجھوڑنا مقصود ہوتا ہے تو یہ برا کہنا ان کی بد عملی کی برائی ہے
نہ کہ ان کے وطن کی؛ اس کی وجہ سے کسی علاقے اور حصہ ارضی کی توہین جائز نہ ہوگی۔

بات دراصل یہ ہے کہ زمین تو اپنی ذات میں کسی کشیدگی یا منافرت کی حامل نہیں ہوتی
مگر لوگوں کے اعمال و حرکات اسے نفرت کی جگہ بنا ڈالتے ہیں؛ پس جیسے کسی حصہ زمان کو برا
بھلا یا مخوس کہنا جائز نہیں کیوں کہ زمانہ خود کبھی فاسد نہیں ہوتا البتہ اس کے باشندے برے
اور بھلے ہو سکتے ہیں؛ اسی طرح کوئی علاقہ بھی نفرت و کشیدگی کا حامل نہیں ہوتا؛ البتہ کسی قطعہ
زمین کو مالک الملک اپنی خصوصی تجلیات کا مورد بنادے، اور اس حصہ مکان میں مخصوص
برکات کے آثار سما جائیں تو وہ قطعہ زیادہ قابل تعریف و تقدیس ہو جائے گا؛ لیکن جس جگہ کی
ایسی کوئی خصوصیات نہ ہوں تو وہ جگہ عمومی طور پر ہادیوں کی نسبت سے با برکت رہے گی جس
سے کوئی قطعہ زمین خالی نہیں؛ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ اسلامی نقطہ نظر سے کوئی حصہ

زمین بھی اپنی ذات میں ایسا قابلِ مذمت اور لائقِ نفرت نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے وطنی کشیدگی اور علاقائی منافرت کی بنیاد قائم ہو۔

چنانچہ قرآن حکیم نے وطنی مساوات کا ایک ایسا عجیب و غریب اصول ارشاد فرما دیا کہ جس پر عمل کر لیا جائے تو تمام اقوام وطنی تعصبات سے بالکل پاک ہو جائیں گی، فرمایا:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ ۚ زَمِينَ خَدَا كِي هِي وَه اِپْنِي بَسَنَدُول مِيں
مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ ۚ سِي جَسِي چا هِي وَارث بِنَا دِي تَا هِي وَارث خَرَا كَام
لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٨﴾ (سورة الاعراف) يَابِي اَنهِي لَو كُولِي كِي جَو خَدَا سِي دُرْتِي هِي۔

آیت کے اول جملے میں زمین کو اپنی طرف نسبت دے کر اور اپنی چیز کہہ کر اس میں شرف و فضل کی یکسانی قائم فرمادی کہ اس سے وطنی اونچ نیچ کا سوال ہی باقی نہ رہے، نیز پوری زمین پر اپنی ملکیت ثابت فرما کر مخلوق کی ملکیت ختم کر دی اور ظاہر ہے کہ جب وہ کسی بندہ کی ملکیت نہیں ہے تو اس کے لئے اس پر نہ فخر کی گنجائش باقی رہتی ہے نہ تعصب کی کہ اس سے فرقہ وارانہ کشیدگی کے جذبات ابھریں۔

زمین کے کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہ ہونے کے باوجود اس کا امکان ہوتا ہے کہ کسی حصہ زمین کی ملکیت خدا ہی کی طرف سے کسی فرد یا قوم کو منتقل کر دی جائے اور اب وہ خدا کے بجائے اس کی ملکیت کہلائی جانے لگے تو آیت کے دوسرے جملے میں اس کی بھی نفی فرمادی کہ اگر کسی کو کوئی حصہ زمین پر قدرت و قبضہ ملے گا تو وہ بطور وراثت کے ملے گا نہ کہ بطور ملکیت، اس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی رہے گا جو ایسا وارث ہوگا کہ جس کے بعد کوئی وارث ہی نہ ہو؛ اور سب جانتے ہیں کہ وارث کو محض اس لئے زمین ملتی ہے کہ مورث دنیا میں نہیں رہا ورنہ اگر وہ موجود ہوتا تو زمین وارث کو ہرگز نہ ملتی، سو ظاہر ہے کہ جو صورت اس بارے میں مورث کی ہے کہ وہ چلا گیا اور زمین وارث کی طرف منتقل ہو گئی، وہی صورت اس وارث کی بھی ہے کہ یہ بھی چلا جائے گا اور زمین اس کے وارث کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

اس صورت حال سے دلوں میں بجائے مالکانہ تعصب کے جذبات ابھرنے کے صرف امانت کے احساسات پیدا ہو سکتے ہیں؛ ہر شخص کسی وطن یا حصہ زمین میں رہ کر یہ سمجھے گا کہ جیسے مجھے یہ حصہ زمین محض اس لئے مل گیا ہے کہ میرا مورث دنیا میں نہ رہا اور زمین رہ گئی، ایسے ہی میرا بھی انجام یہی ہوگا کہ میں دنیا میں نہ رہوں گا اور یہ زمین رہ جائے گی جو میرے وارثوں کے ہاتھ لگ جائے گی؛ اور جب میرے بعد بھی اس زمین کو چھوڑ چھوڑ کر سب لوگ اسی طرح چل دیں گے جس طرح مجھ سے پہلے والے اسے چھوڑ چھوڑ کر چل دئے تو زمین کا مالکانہ قبضہ صرف اسی ذات کا رہے گا جو اس زمین کو نہ کبھی چھوڑ کر گیا نہ آئندہ جائے گا، کیوں کہ وہ ذات ایسی ہے کہ جس کے بعد کوئی ہے ہی نہیں کہ اس کا وارث بن سکے؛ پس وہی حقیقی وارث ہے اور وہی حقیقی مالک ہے۔ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ﴿۵۸﴾

ظاہر ہے کہ جب آدمی کو یہ سمجھ میں آجائے کہ وہ زمین یا وطن کا نہ مالک حقیقی ہے نہ مالک عارضی؛ صرف چند دنوں تک اس میں تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے، اور وہ بھی مالک ہونے کی حیثیت سے نہیں صرف وارث ہونے کی حیثیت سے، تو اس میں کسی خطہ زمین کے بارے میں مالکانہ اور متعصبانہ جذبات ابھرنے ہی نہیں پائیں گے جو جذبات آدمی کے اندر وطنی منافرت اور وطنی فرقہ واریت پیدا کر کے ایک دوسرے کو لڑا دیتے ہیں۔

بہر حال! اسلام نے وطنی تعصب ختم کرنے کے لئے اول تو تمام وطنوں کے فضائل اور تقدیس کا دروازہ کھولا تا کہ وطنی توہین کا دروازہ بند رہے، اور قومیں ایک دوسرے کے قریب ہوں اور ان میں وطنی منافرت اور اونچ نیچ نہ پیدا ہو؛ اور پھر ساری زمین اور سارے ہی وطنوں پر خدا کی ملکیت کا اعلان کر کے انسانوں کو اس میں یکساں حق دیا اور یکساں وارث بتایا، تا کہ اس طرح بھی وطنی مساوات کا جذبہ ابھر کر وطنی فرقہ واریت جڑ سے ختم ہو جائے، تو میں وطنی محبت کی راہ سے بھی ایک دوسرے پر تحقیر و توہین کے حملے نہ کر سکیں؛ اس سے اسلام کی ہمہ قومی مساوات کے ساتھ اس کی ہمہ وطنی یکسانیت بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے،

اور واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب اور ازم ہے جو ہر قسم کے تعصب اور نابرابری سے پاک رہ کر دنیا کی اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہے؛ پس جو لوگ محدود علاقوں میں محدود فرقوں کو جمع کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انہوں نے وطنی جمہوریت قائم کر لی ہے وہ درحقیقت دھوکے میں ہیں؛ حقیقی اور عالمی جمہوریت — جس کا نقشہ ابھی اسلامی تعلیمات سے پیش کیا گیا ہے — اسے بھی فرقہ واریت ہی کہتی ہے، جس میں سینکڑوں وطنی تعصبات پرورش پاتے رہتے ہیں اور جس وقت ابھرتے ہیں تو دنیا کو تہہ بالا کر ڈالتے ہیں؛ اس لئے جب بھی دنیا فرقہ واریت کو صحیح معنی میں ختم کرنا چاہے گی یا عالمی جمہوریت قائم کرنے کا ارادہ کرے گی جس میں تمام اقوام اور تمام اوطان برابر ہوں تو اسے صرف اسلامی جمہوریت ہی کے دامن میں پناہ مل سکے گی جس میں نسلی، نسی اور وطنی فرقہ واریتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر حقیقی مساوات کا اصولی اور قانونی نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

مالی فرقہ واریت اور اسلام

تعصب و نفرت کی ایک اور مؤثر اور مہلک جڑ مالی فرقہ واریت ہے؛ یعنی مال کی تقسیم ایسے غلط انداز سے ہو کہ طبقاتی توازن اور مناسب برابری قائم نہ رہے؛ ایک طبقہ بے حد مال دار اور ایک بے حد نادار ہو جائے، جس سے مالی اونچ نیچ پیدا ہو کر طبقاتی کشمکش شروع ہو جائے؛ اس صورتحال کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک افراط کا پہلو جس میں ایک طبقہ تو خوب مال دار ہو اور دوسرا نادار اور محض مزدور ہو، جس کی محنت سے مال دار طبقہ عیش کرتا رہے، اس صورت میں طبقاتی منافرت یقینی ہے جسے مالی فرقہ واریت کہا جاسکتا ہے؛ دوسرا پہلو تفریط ہے کہ اس اونچ نیچ کو مٹانے کے لئے مالی مساوات قائم کر کے قانون کی قوت سے اسے زبردستی نافذ کر دیا جائے، یعنی سرمایہ دار سے سارا سرمایہ چھین کر ملک کے خزانے کو دے دیا جائے پھر اسی خزانے سے سب کو برابر تقسیم کر دیا جائے، اس سے بھی کشمکش رفع نہیں ہو سکتی، کیوں کہ انسانوں میں مال کمانے کی استعدادیں الگ الگ ہیں، جس کا فطری تقاضہ ہے کہ

ہر ایک کے پاس اس کی صلاحیت و محنت کے اعتبار سے دولت اور مال ہو، جس کی صلاحیت و محنت کم ہے اس کے پاس کم، اور جس کی زیادہ ہے اس کے پاس زیادہ؛ اس فطری تقاضے کے برخلاف ان کے درمیان اگر زبردستی مالی برابری اور معاشی مساوات قائم کر دی جائے تو اول تو سرمایہ دار کے دل میں غصہ پیدا ہوگا کہ کمائی میری ہے اور اس میں زبردستی کے حصے دار وہ بنائے گئے ہیں جن میں مال کمانے کی صلاحیت ہی نہیں، ادھر نادار اس حصے کو انتقامی جذبات کے ساتھ قبول کرے گا کہ بہت عرصے کے بعد اس سرمایہ دار پر قابو ملا ہے، اس نے بہت دن عیش کی ہے، اب ہم بھی کریں گے؛ اس سے سرمایہ دار کا غیض و غضب اور بھی بڑھ جائے گا؛ اسی کے ساتھ دوسری مضرت یہ ہوگی کہ سرمایہ دار میں کمانے کا جذبہ ختم ہو جائے گا؛ اس لئے کہ جب وہ دیکھے گا کہ میں اپنی محنت کی کمائی سے خود فائدہ نہیں اٹھا سکتا، محنت میں کروں گا اور نفع دوسرے اٹھائیں گے تو ایسی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب یہ جذبات و احساسات عام ہونے لگیں گے تو پوری قوم میں پھیل کر وہ بے عملی اور کاہلی کا سبب بن جائیں گے؛ اور اس سے ملک کی اقتصادی قوت مفلوج ہو کر رہ جائے گی؛ ادھر نادار طبقے کو جب کم سے کم محنت پر بھی اتنا ہی مال مل جائے گا جتنا کہ پوری محنت پر ملتا تھا تو اس میں بھی کام نہ کرنے اور بے کار رہنے کے جراثیم پھیلنے لگیں گے، اس طرح زندگی کا سارا نظام بے اثر ہو کر رہ جائے گا؛ اس لئے مالی فرقہ واریت نہ معاشی اونچ نیچ سے جاسکتی ہے نہ معاشی مساوات سے، بلکہ معاشی توازن کے قائم کرنے اور اخلاقی مساوات پیدا کرنے سے جاسکتی ہے؛ جیسا کہ اسلام نے فطری طور پر اس مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا ہے کہ سب سے پہلے تو اس نے بتلایا کہ یہ مال تمہارا نہیں خدا کا ہے، جتنا چاہے دے اور جتنا چاہے روک لے، اس لئے جتنا ملے اس پر شکر کرو اور جو نہ ملے اس پر صبر کرو اور خوش دلی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں سے راضی اور مطمئن رہو؛ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مالدار کے دل میں غرور و فخر نہیں آسکتا، اور نادار کے دل میں شکوہ و شکایت نہیں آسکتا۔

لَّيْلًا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ ۖ وَلاَ تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ^ط
 تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج
 نہ کرو، اور جو چیز تم کو عطا فرمائی گئی اس پر
 (سورۃ الحديد: ۲۳) اتراؤ نہیں۔

پس جب انسانی ملکیت کا تصور ہی ختم ہو گیا تو فخر و تعصب اور رقابت و تحقیر کے جذبات
 یہیں ختم ہو گئے اور باہمی کشمکش باقی نہیں رہی۔

اب مال کی تقسیم کا سوال رہ جاتا ہے، سو اگر وہ بھی فرمودہ خداوندی کے مطابق ہو
 جائے تو تسلی یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں بے انصافی یا جانب داری کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا،
 جس سے دینے یا لینے والے کے دل میں مایوسی اور نفرت پیدا ہوا کرتی ہے، اس لئے دینے
 اور لینے والوں اطمینان قلب اور پورے اعتماد کے ساتھ دیں گے اور لیں گے، اس سے
 تقسیم کے اندر جذباتی کشمکش کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد تقسیم دولت کا آسمانی نظام دیکھئے کہ اس میں مالک حقیقی نے کتنی ہی چیزوں
 میں تو شخصی ملکیت رکھی ہی نہیں جس سے آپسی کشمکش ہو جاتی، جیسے سمندر اور سمندری ذخیرے
 آزاد ہیں، پہاڑ، لکڑی اور ہر نوع کا شکار آزاد ہے، کوہستانی معدنیات آزاد ہیں، نمک سازی
 آزاد ہے، شہر کے متصل افتادہ زمینیں آزاد ہیں جن میں اپنے اپنے جانور چرائے جاسکیں
 وغیرہ۔ آج کی جنگیں سمندر کے ساحلوں کے مسائل پر ہو رہی ہیں، تری و خشکی کے مسائل پر
 ہو رہی ہیں، جنگلات کی ملکیت کے مسائل پر ہو رہی ہیں، کانوں اور معدنیات کے قبضوں پر
 ہو رہی ہیں اور اس پر جائیں تلف ہو رہی ہیں، آبادیاں اجاڑی جا رہی ہیں اور امن و امان
 برباد کیا جا رہا ہے، جب کہ اسلام نے ان میں شخصی ملکیتیں ہی باقی نہیں رکھیں، اُن پر تمام
 مخلوق کا حق قرار دیا ہے، البتہ بعض اموال پر شخصی ملکیت قائم کی، جیسے تجارت کے ذریعہ کمایا
 ہوا مال تو اس میں بھی ناداروں کا حق بتا کر ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا مگر ان الفاظ میں دیا:

أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ
 خرچ کرو ان چیزوں میں سے جو ہم نے تم
 (سورۃ البقرۃ: ۲۵۴) کو دی ہیں۔

اس ترغیبی انداز کا فائدہ یہ ہے کہ اب اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنے میں کوئی تنگی نہیں ہو سکتی، پھر اس میں بھی طبائع کی رعایت رکھ کر علاحدہ قوانین پیش کئے گئے، جس مال کے کمانے میں محنت زیادہ ہے اس میں دوسرے کا حق کم کر دیا گیا ہے کیوں کہ اس کے تقسیم کرنے میں دل پر بوجھ ہوتا ہے، اس کے برخلاف جس مال کے حصول میں بندہ پر محنت کم ہے اس میں غربا کا حق بڑھا دیا ہے تاکہ دینے میں گھٹن نہ ہو اور خوش دلی سے مال تقسیم کیا جائے؛ سب سے زیادہ محنت تجارت میں ہے کہ تاجر کا دماغ چوبیس گھنٹے تجارت کے جوڑ توڑ میں لگا رہتا ہے اس لئے اس میں سالانہ محصولِ زکوٰۃ چالیسواں حصہ رکھا گیا ہے، یعنی سو پر ڈھائی روپیہ جو کم سے کم ہے؛ اس سے کم محنت زراعت میں ہے کہ کھیتی پر کسان کو تین چار ماہ کی محنت ہوتی ہے یعنی آب پاشی وغیرہ، اس کے بعد وہ پیداوار لے کر گھر آ جاتا ہے اور سال بھر کھاتا ہے، اس لئے اس پر محصول بڑھا دیا گیا اور بیسواں حصہ غربا کا حق رکھ دیا گیا، یعنی سو پر پانچ روپیہ؛ اور اگر زمین بارانی ہے اور آب پاشی کی محنت بھی نہ کرنی پڑی صرف تخم ریزی اور دو تین ماہ دیکھ بھال پر معاملہ ختم ہو گیا تو شرعی محصول اور زیادہ کر کے دسواں حصہ رکھ دیا گیا، یعنی سو پر دس؛ اور اگر بلا محنت و مشقت مال کمایا مثلاً کوئی دھنیہ ہاتھ لگ گیا تو محصول اور زیادہ بڑھا کر پانچواں حصہ کر دیا گیا، یعنی سو پر بیس؛ پھر اسی طرح جانوروں میں زکوٰۃ رکھی گئی اور بیت المال کے واسطے سے ان میں غرباء کا حق قائم کیا گیا، مثلاً اونٹوں میں جو دو سال کے پورے ہو کر تیسرے سال میں قدم رکھیں اور پانچ کی تعداد میں ہوں تو ان پر ایک بکری غریبوں کے لئے لی جائے گی، گایوں کی تعداد تیس تک ہو جائے تو ان میں سال بھر سے زیادہ کا ایک بچھڑا لیا جائے گا، بکریاں چالیس ہو جائیں تو ان میں سے ایک بکری لی جائے گی؛ گھوڑوں میں فی گھوڑا ایک دینار سالانہ یا ان کی قیمت لگا کر ہر دو سو روپیہ پر پانچ روپیہ زکوٰۃ

لی جائیگی۔

بہر حال مال نقد کی صورت میں ہو یا سامان تجارت ہو یا چوپائے ہوں یا زمین سے حاصل شدہ غلہ ہو ان سب میں زکوٰۃ یعنی قانونی محصول رکھا گیا؛ پس اگر کسی کے پاس مثلاً ایک لاکھ روپیہ سرمایہ ہے تو سال گزر جانے پر اس کا چالیسواں حصہ یعنی ۲۵۰۰ روپیہ غرباء کے لئے قانوناً وصول کر لئے جائیں گے، اس کے علاوہ سرمایہ دار کو رمضان کے ختم پر فی کس پونے دو سیر گیہوں غرباء کو دینی ہوتی ہے، اسی طرح بقر عید کے موقعہ پر قربانی لازم کی گئی ہے جس سے غرباء کو مختلف طریقوں سے فائدہ پہنچتا ہے؛ اس قانونی انتظام کے بعد اخلاقی قدروں کو بلند کر کے غرباء پروری کا بے مثال نظام بنادیا، ارشاد ہے:

وَإِحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ جس طرح خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ

(سورۃ القصص: ۷۷) احسان کیا ہے تو بھی دوسروں پر احسان کیا کر

احسان، صلہ رحم اور حسن سلوک کی اسلام میں اتنی ترغیب دی گئی ہے کہ اگر وہ دل میں رنج بس جائے تو وہ خود غریب بن کر غرباء کو امیر بنادے گا، اور اس میں سخاوت اور راہ خدا میں خرچ کرنے کا جذبہ موجزن ہوگا، جیسا کہ یہ عادت مسلمانوں کے معاشرہ میں ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔

مزید یہ کہ دنیا اور عیش دنیا کی بے ثباتی اور ناپائنداری کی حقیقت سمجھا کر اپنے ماننے والوں کے دل سے مال کی محبت اس طرح نکال دی گئی کہ سچے مسلمان کی نظر میں سونا چاندی اور کنکر پتھر میں کوئی فرق نہیں ہوتا، اور وہ اپنا مال بے دریغ خرچ کرنے میں جری اور جمع کرنے میں محتاط ہو جاتا ہے، اور آخر میں قانون وراثت رکھ دیا ہے، جس سے مال و دولت اور جائیداد وغیرہ ایک گھر میں محدود ہو کر نہیں رہتے، بلکہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

ان تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اسلام نے مالیات کے نظام کو جمع کرنے کے اصول

کے بجائے تقسیم کے اصول پر قائم کیا ہے؛ پس جس مذہب میں مالیاتی سلسلہ قائم ہی تقسیم کے اصول پر ہوا اور جمع کو اس میں مذموم رکھا گیا ہو اور اوپر سے اس میں اجر و ثواب کے وعدے اور رضائے الہی کی بشارتیں بھی دی گئی ہوں تو اس مذہب میں مال نہ صرف تقسیم ہوگا بلکہ دل کی انتہائی بشارت اور امنگ سے تقسیم ہوگا، اور ظاہر ہے کہ غرباء اسے نہایت ہی منت پذیری اور احسان مندی سے قبول کریں گے، کیوں کہ وہ انہیں عزت نفس کے ساتھ ملے گا، دینے والا احسان جتنا کر نہیں دے گا بلکہ احسان مان کر دے گا، حق سمجھ کر دے گا، نیز اپنی خوشی سے دے گا کسی کے جبر و زبردستی سے نہ دے گا؛ جس سے ایک طرف تو ایک طرح کی مالی مساوات قائم ہو جائے گی اور دوسری طرف امیر و غریب میں اخلاقی رابطہ استوار ہوگا اور محبت و مودت کے جذبات پیدا ہوں گے، مال دار طبقہ تو تقسیم کر کے یوں خوش ہے کہ میری دنیا بھی درست ہوگئی اور آخرت بھی بن گئی، نیز عطا کرنے کی فرحت و بشارت بھی اس کے دل میں ہوگی، احسان کرنے کی مسرت سے بھی دل لبریز ہوگا۔

ادھر نادار طبقہ مال لے کر یوں مسرور ہوگا کہ ہم لاوارث اور مسکین نہیں ہیں، یہ امراء ہمارے سر پرست، ہمارے محسن اور ماں باپ کی جگہ پر ہیں، جو کسی حالت میں ہمیں فراموش نہیں کرتے؛ زمین سے غلہ آنے پر ہمیں یاد کرتے ہیں، تجارت کے مال میں سالانہ ہمیں یاد کرتے ہیں، جانور بڑھ جائیں تب ہمیں یاد کرتے ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ آجائے تو ہمیں نہیں بھولتے، خزانہ مل جائے تب ہمیں فراموش نہیں کرتے، غرض احسان و سلوک میں کسی وقت ہمیں نہیں بھولتے تو ان سے زیادہ ہمارا خیر خواہ اور کون ہو سکتا ہے؟ اس لئے اس اسلامی اصول پر امیر تو غریب کا محسن ہوگا اور غریب امیر کا خادم، وہ مہربان ہوگا یہ فرماں بردار ہوگا۔

اس طرح قوم کے ان دو بنیادی طبقوں میں مالی، اخلاقی، قانونی، معاشرتی، معاشی توازن قائم ہو جائے گا؛ چنانچہ آج کل کے اس کشمکش والے دور سے قبل جو اسلامی دور گذرا ہے، جس میں مسلمانوں نے اپنے ان فطری اصولوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا تھا وہ دور اس

بات کا گواہ ہے کہ یہ طبقاتی کشمکش عمل میں تو کیا خیالات میں بھی موجود نہ تھی، سرمایہ دار اور نادار کا سوال ہی درپیش نہ تھا، ہر ایک سرمایہ دار تھا اور ہر ایک محتاج بھی تھا؛ ان اصولوں کے تحت سرمایہ داری کا وجود ہی قائم نہ ہوتا تھا کہ ناداری کا سوال اٹھے، اور اگر کہیں وجود ہوتا بھی تھا تو ایسے سرمایہ دار سے سب سے زیادہ خوش نادار ہی رہتا تھا، کیوں کہ اس کی سرمایہ داری محتاجوں اور ناداروں ہی کی پرورش کے لئے ہی ہوا کرتی تھی؛ اسلام نے مالیات کے سلسلے میں دونوں جانبوں کو ایک ایسی معتدل اور موزوں سطح پر قائم کر دیا تھا کہ معاملے کے دونوں فریق اپنے اپنے دائرے میں خوش اور مطمئن رہ سکیں، جس سے ملت میں طبقاتی کشمکش، فرقہ واریت اور فریقوں کی اونچ نیچ کی بنیادیں ہی منہدم ہو گئی تھیں، اس لئے آج بھی دنیا جب بھی اقتصادیات کا صحیح حل دریافت کر سکے گی تو وہ بلاشبہ اسلام ہی کا اقتصادی نظام ہوگا، اس کے علاوہ کوئی اور نہ ہوگا۔

سیاسی فرقہ واریت اور اسلام

فرقہ واریتوں میں سب سے زیادہ تباہ کن اور مہلک فرقہ واریت سیاسی فرقہ واریت ہے؛ جس میں اقتدار کے لحاظ سے پارٹیاں یا فرقے بنتے ہیں، اور وہ محض اپنی کرسی و اقتدار کے لئے سادہ لوح عوام کو استعمال کر کے اپنی مخالف پارٹیوں سے ٹکر لیتے ہیں؛ بظاہر یہ ٹکر نہایت پر امن، منظم اور معصوم ہوتی ہے لیکن اس کی تہ میں سب سے زیادہ بد امنی، بے اطمینانی اور تباہ کن کشمکش چھپی ہوتی ہے؛ دنیا میں جنگ کے نام پر کبھی اتنی تباہی نہیں ہوتی جتنی اس امن کے نام سے ہوتی ہے؛ اقتدار کی ہوس ہی میں پارٹیاں ہنسی اور بگڑتی ہیں؛ وہ لوگ جو دین و مذہب کے نام پر جماعتوں میں بٹنے سے گھبراتے ہیں وہی لوگ دنیا اور سیاست کے نام پر انسانیت کو بانٹ کے اتنی تباہیاں لاتے ہیں کہ دین کے نام پر بٹنے سے ان کا دس فیصد بھی نہیں آسکتی؛ ہر پارٹی عوام کے جذبات اور رجحانات کو دھوکہ اور فریب کے ذریعہ اپنی طرف کھینچتی ہے اور انجام کار ان کے دو گروہ بنا کر ان کے جذباتی ٹکراؤ

کا تماشہ دیکھتی ہے، ان کے خون سے کھیل کر اور اسے اپنی کامیابی قرار دے کر مسرور اور شاداں ہوتی ہے۔

دینِ فطرت نے اس فرقہ واریت کی بنیاد بھی منہدم کر کے رکھ دی ہے، اس نے سرے سے انسانی حکم رانی ہی کا خاتمہ کر دیا ہے، اسلام نے حکومت صرف اللہ کی تسلیم کی ہے، اور انسان کو حاکم یا فرماں روا کے بجائے اللہ تعالیٰ کا نائب اور فرماں بردار بتایا ہے، تاکہ سب انسان مل کر یہ نعرہ لگائیں کہ ”ہمارا تمہارا خدا بادشاہ“، اسلام کا یہ اصول پارٹیوں، ملکوں، اور حکومتوں کی کشمکش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے؛ کیوں کہ سیاسی کشمکش کا آغاز ہی اس نعرے سے ہوتا ہے کہ ”ہم آقا اور تم غلام!“ یا ”ہم بادشاہ اور تم رعایا!“۔ لیکن جب ہر قوم دوسری قوم سے کہے کہ آقا نہ ہم نہ تم! بلکہ ہم سب کا آقا اور بادشاہ خدا ہے اور ہم سب پر خدا کا مستند اور فطری قانون حکم ران ہے تو یہ نعرہ نہ صرف انسانوں کی سیاسی کشمکش کو ختم کر ڈالتا ہے بلکہ ان کے جذباتِ اقتدار کو بھی ٹھنڈا کر کے ان میں بندگی اور عبودیت کی شان پیدا کر دیتا ہے، جس سے باہمی اتحاد اور آپسی محبت قائم ہو جاتی ہے، اسلام نے یہی نعرہ لگایا کہ:

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا
إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ
وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۰﴾

حکم صرف خدا کا ہے، تمہارا کام صرف اس کا حکم ماننا ہے، یہی سیدھا راستہ ہے، لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

(سورۃ یوسف)

یعنی لوگ اس سیدھی بات کو نہ سمجھتے ہیں نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، حالاں کہ بات بالکل سیدھی سی ہے کہ ملوکیت و بادشاہت فساد کا نام ہے اور خلافت صلاح و اطمینان کا نام ہے؛ اس کے باوجود تعجب ہے کہ دنیا یہ تو مان چکی ہے کہ بد امنی کی جڑ ملوکیت اور شہنشاہی ہے، لیکن غلطی یہ کہ ملوکیت کے معنی شخصی حکومت کے لے کر جماعتی حکم رانی پر آ گئے، حالاں کہ ملوکیت اور بادشاہی کے معنی شخصی حکومت کے نہیں ہیں، انسانی حکومت کے ہیں، اب انسان

خواہ ایک ہو یا ایک ہزار وہ جب حکم رانی پر آئے گا تو اسی کا نام شہنشاہی ہوگا، اور اس سے وہ سب فتنے اور نقصانات سماج میں نمایاں ہونگے جو انسانی بادشاہت کے لوازم ہیں، یعنی رعایا کو غلام بنانا، شخصی و ذاتی خدمات کے لیے ان پر زبردستی کرنا، ظلم و زیادتی کرنا، ان میں تفریق، تقسیم، اور اونچ نیچ پیدا کرنا، انہیں ترقی نہ کرنے دینا، ان کا سرمایہ ہڑپ لینا، اور ان کی زمینیں غصب کرنا، اور ناحق ان کا خون بہانا وغیرہ۔

اسلام نے ان تمام اونچ نیچ کو جڑ بنیاد سے ختم کر کے خالص فطری نظام حکومت کی طرف توجہ دلائی ہے؛ جس میں رعایا کے درمیان یکسانیت ہو، مساوات ہو، اور مراعات ہو، اور مروت اور خیر خواہی ہو؛ اس نے طبعی جذبات کو مٹایا بھی نہیں اور آزاد بھی نہیں چھوڑا؛ بس ایسی شرطوں کا اضافہ کر دیا کہ وہی جذبات صحیح راستے پر پڑ جائیں اور ان کے اندر دبی چھپی مضر توں سے بھی نجات مل جائے؛ یہ قیود اور شرائط ایسی ہیں جن سے ہر اجتماعی شعبہ حیات میں یکسانیت اور فطری مساوات قائم ہو کر ہر طرح کی اونچ نیچ اور فرقہ واریت ختم ہو جو حباتی ہے۔ مثلاً:

نسب کے سلسلے میں إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقٰكُمْ کی قید سے نسلی اونچ نیچ اور نسبی فرقہ واریت مٹادی، جس سے خود بہ خود انسانی مساوات قائم ہوگئی۔

نسبت میں لَا تَفْرِقْ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ کی قید سے نسبتی اونچ نیچ اور مذہبی فرقہ واریت کو مٹادیا، جس سے ایمانی مساوات پیدا ہوگئی۔

فضیلت کے سلسلے میں تقابلی مدح ممنوع ٹھہرا کر تفضیلی اونچ نیچ مٹادی جس سے مدحیاتی اور اعتقادی مساوات قائم ہوگئی۔

وطنیت کے سلسلے میں إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ کی قید لگا کر وطنی اونچ نیچ اور جغرافیائی فرقہ واریت مٹادی، جس سے وطنی مساوات قائم ہوگئی۔

دولت کے سلسلے میں مَلِكِ الْإِلٰهِ اور اِنْفَاقِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ کی قید سے مالی

فرقہ واریت مٹادی جس سے معاشی مساوات نمایاں ہوئی۔

حکومت کے سلسلے میں **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ** کی قید سے انسانی حکومت اور مخلوقاتی جاہ و اقتدار کی فرقہ واریت اور پارٹی سسٹم مٹا دیا، جس سے سیاسی مساوات قائم ہو گئی۔

بہر حال! کسی بھی دو طرفہ معاملے میں جانب داری یا افراط و تفریط کا ایسا شائبہ تک باقی نہیں چھوڑا جس سے یہ فرقہ واریتیں ابھرتی ہیں، بلکہ عدل و اعتدال کا نقطہ خصوصیت کے ساتھ نمایاں کر کے سامنے رکھ دیا ہے اور ان میں سے کسی بھی چیز کے لینے نہ لینے کا معیار خدا کا نام اور خدا کا حکم قرار دیا ہے، جس کی حکم رانی اور حقیقی بادشاہت اور اس کی اطاعت و فرماں برداری سے دنیا کے کسی فرد بشر کو انکار نہیں؛ اسی لئے اس نے اعلان عام کیا:

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا
وَبَيْنَكُمْ إِلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا
نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا
بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ
تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا
مُسْلِمُونَ ﴿۶۴﴾

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے
اور تمہارے درمیان برابر ہے، وہ یہ کہ بجز
اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں
اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراویں
اور خدا تعالیٰ کے علاوہ ہم میں سے کوئی
کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے، پھر اگر

(سورۃ آل عمران)
وہ لوگ نہ مانیں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم اس
کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

خلاصہ یہ نکلا کہ دنیا کے ان بکھرے ہوئے عناصر و افراد کو — جو فرقہ وارانہ کشمکش میں پڑے دم توڑ رہے ہیں — نہ وطن جوڑ سکتا ہے کہ اس میں خود حد بندی اور تفریق ہے۔ نہ نسل و خون جوڑ سکتا ہے جس میں خود رنگ و بو کا تضاد ہے، نہ قومیت جوڑ سکتی ہے جس میں خود کالے گورے اور روشن و تاریک کا فرق ہے، نہ دولت و حکومت جوڑ سکتی ہے جو خود حرص و ہوس کے ٹکراؤ اور تضاد سے جنگوں کا سبب بنی ہوئی ہے، نہ مختلف مذاہب کے لیبل جوڑ سکتے

ہیں جو خود رنگارنگ ہو کر انسانوں کو رنگ برنگ کئے ہوئے ہیں؛ بلکہ صرف وہی اکیلی ذات جوڑ سکتی ہے جس میں نہ تفوق ہے نہ ترکیب، نہ جزئیت ہے نہ بعصیت، نہ رنگ ہے نہ بو، نہ صورت کی حد بندیاں ہیں نہ شکل کی رنگارنگیاں، نہ نسلیت ہے نہ قومیت، نہ وطنیت کی نسبت ہے نہ قومیت کی خصوصیت، نہ حد بندی ہے نہ تفریق و تقسیم، بلکہ وحدانیت محضہ ہے، یکتائی ہے، محبوبیت عامہ ہے، مرکزیت مطلقہ ہے؛ وہ جو سارے وطنوں سے بالاتر، تمام قومیتوں سے اوپر، ہر نسل اور خون سے بری، ہر محتاجگی سے منزہ، ہر عیب و نقص سے مبرا، ہر غرض اور لوٹ سے پاک اور ہر جانبداری اور طرف داری سے مقدس ہے؛ اور اس لئے سارے وطنوں پر یکساں حکم راں، ساری نسلوں کا بلا شرکت غیرے خالق، ساری قوموں کا تہما ربی اور سارے ہی زمان و مکان اور ارواح و اجسام میں تنہا متصرف ہے؛ جس کا نام مبارک اللہ ہے، جس کی شان غنی عن العالمین ہے، جس کا لقب رب العالمین ہے، جس کی صفت الرحمن الرحیم ہے، جس کا خطاب احکم الحاکمین ہے؛ اسی کی معبودیت پر سب متفق ہیں، اسی ایک کو سب اپنا مالک مانتے ہیں، اور اسی کو سب — مختلف ناموں سے — یاد کرتے اور پکارتے ہیں؛ اس لئے ان بکھری ہوئی قوموں کو اسی کا نام جوڑ سکتا ہے جو سب کے دلوں میں یکساں عظمت والا ہے کہ اس کا نام آتے ہی سب گردن جھکا دیتے ہیں۔

ایک وطن والا دوسرے کے وطن کے آگے کبھی نہیں جھکے گا، لیکن یہ دونوں وطن والے مل کر اس اللہ کے نام پر جھک جائیں گے؛ ایک قوم دوسری قوم کی غلامی اور زبردستی کبھی قبول نہیں کرے گی، لیکن یہ دونوں قومیں مل کر خدائے برتر کی غلامی میں فخر محسوس کرنے لگیں گی؛ ایک نسل دوسری نسل سے رقابت کا چور دل میں رکھے ہوگی، لیکن یہ ساری نسلیں مل کر اس کی حاکمیت کو بالیقین مان لیں گی؛ پس ہر اونچ نیچ کو مٹا کر، ہر ذات پات کو قطع کر کے، ہر فرقہ واریت کو ختم کر کے جو چیز دنیا کے ان متضاد عناصر کو ایک سطح پر لاسکتی ہے وہ خدا کا نام ہے؛ یعنی ہم میں اور تم میں جو چیز یکساں اور برابر ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کا معبود ہونا ہے؛ اگر

بلا شرکتِ غیرے اس کی ذات کو سب اپنے سامنے رکھ لیں تو یہی ایک نقطہ وہ مشترک نقطہ ہے جو اقوامِ عالم کو جوڑ سکتا ہے؛ یہی وہ کلمہ ہے جس کو کَلِمَۃً سَوَآءٍ بَیِّنًا وَبَیِّنًا کے بلند عنوان سے قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے۔

پس اسلام نے اگر فرقہ واریتیں مٹانے کے لئے قوموں کی شخصی خصوصیتوں سے الگ ہو کر ایک ایسی بات کی طرف توجہ دلائی جو ہر انسان کے لئے قابلِ قبول ہے، تو کیا یہ اسلام کا کوئی ایسا جرم ہے کہ اسے فرقہ واریت بتا کر لوگوں کو اس سے ڈرایا جائے؟ اسلام تو انتہائی وسعت اور رواداری سے کام لے کر دنیا کی قوموں کو فرقہ وارانہ کھینچ تان سے بچاتے ہوئے ایک مشترک نکتے کی طرف لا رہا ہے، تاکہ دنیا کی قوموں کے درمیان باہمی شرکت، عمومیت اور وسعت پیدا ہو جائے؛ اور واضح کر رہا ہے کہ انسانیت کو عمومی اشتراک اور جمہوریت پر لانا چاہنے والے اگر دولت، نسل، قوم، رنگ، اقتدار وغیرہ کے نقطوں پر اقوامِ عالم کو جمع کرنا چاہیں گے تو وہ نہ صرف یہ کہ اس مقصد میں ناکام ثابت ہوں گے بلکہ فرقہ واریت کی آگ کو اور بھڑکا کر رکھ دیں گے، کیوں کہ یہی چیزیں تو فرقہ واریتوں کا سرچشمہ ہیں جن کی وجہ سے دنیا فرقہ وارانہ تعصبات کے جہنم میں جل رہی ہے تو پھر انہیں سے فرقہ واریت کو مٹانے کی امیدیں باندھنا یا تو دانستہ طور پر دوسدوں کو جمع کرنا ہے جو عملاً ممکن نہیں یا نادانستہ دنیا کو دھوکہ دینا ہے جو انتہائی خود غرضی ہے۔

ایک اشکال اور جواب

کہا جاسکتا ہے کہ آج خدا اور مذہب کا نام لے کر بھی فرقہ وارانہ کشمکش کو ہوا دی جا رہی ہے، اور اس نام پر بھی تو لاکھوں بندگانِ خدا کے خون اور جذبات سے کھیلا جا رہا ہے تو یہ نام بھی فرقہ وارانہ کشیدگیوں کا سبب کہلائے گا، اس صورت میں قرآن کا اس نام کو کَلِمَۃً سَوَآءٍ فرمانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ قرآن حکیم نے محض خدا کے نام یا مذہب کے لیبل کو بطور نقطہ اشتراک پیش نہیں کیا، بلکہ خدا کی تنہا معبودیت اور

بلاشرکتِ غیرے حاکمیت کو قدرِ مشترک اور کلمۂ سوا کہا ہے، جس کی تمام دنیا نہ صرف دعوے دار ہے بلکہ اسے دل سے معقول بھی تسلیم کرتی ہے؛ فرق صرف اتنا ہے کہ اور قوموں نے فرقت اور اختلاف مٹانے کا پروگرام اس بینِ عالمی کلمہ سے اخذ نہیں کیا، بلکہ وطن، قوم اور نسل وغیرہ کے کلمات سے لیا ہے جو خود فرقہ وراثتوں کا سرچشمہ ہیں، مگر اپنی غلط فہمی یا خود غرضی سے اسے تہذیب کا نام دے دیا ہے اور خدا کے نام پر پاکم از کم اس کا نام لے کر یہ وطنی اور قومی خود غرضیاں پھیلا رکھی ہیں؛ اس لئے لوگوں کی یہ ساری اختراعی فرقہ بندیوں خدا کے نام لگ جاتی ہیں اور سطح پرستوں کو یوں نظر آنے لگتا ہے کہ یہ ساری جنگیں اور قومی جھگڑے خدا کے نام نے دنیا میں پیدا کر رکھے ہیں یا مذہب کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔

اس کے برعکس اسلام نے چونکہ ان سب وطنی، قومی، نسلی اور لسانی وغیرہ امتیازات کو مٹا کر عالمی بھائی چارگی اور عالمی اتحاد کا عملی پروگرام اس ذات سے لیا ہے جو بینِ عالمیت سے بھی بالاتر ہے، کیوں کہ سارے عالم ہی خود اس کی لامحدود وسعتوں کے احاطے میں داخل ہیں، اور ہماری یہ ساری حد بندیاں اس کی لامحدودیت کے سامنے آ کر ختم ہو جاتی ہیں؛ اس لئے وہ فرقت و اختلاف کا الزام تو کھلے عام ان وطن اور قوم وغیرہ کے دیوتاؤں کے سر ڈالتا ہے اور وحدت و اتحاد، عالمگیریت اور بین الاقوامیت کی وسعتیں خدائے برتر کی طرف منسوب کرتا ہے جو ایک واقعی حقیقت ہے، اسلام نہ خود فریب میں مبتلا ہے نہ دوسروں کو فریب دینا چاہتا ہے، بلکہ جو جس کا حصہ ہے وہ اس کو دیتا ہے، وحدت خدا کو دیتا ہے جو اس کا حق دار ہے اور شرک و کثرت اور اس کی تضاد سامانی ان وطن اور قوم وغیرہ کے رشتوں کو عطا کرتا؛ جو اس کے حق دار ہیں۔

اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اور قوموں کے پاس اس دعوے یا عقیدے کا کہ خدا کا نام ہم سب میں قدرِ مشترک ہے کوئی پروگرام نہیں ہے، جسے پیش کر کے وہ تمام اقوام کو جوڑ سکیں؛ ان کے پاس پروگرام ہے تو اسی وطنیت اور قومیت وغیرہ کا ہے جس کو قابلِ قبول بنانے کے

واسطے زبردستی خدا کے نام منسوب کر دیا جاتا ہے، مگر اس زبردستی کی نسبت سے اس کے فرقہ وارانہ اثرات ختم نہیں ہو جاتے، خدا کے نام منسوب کرنے کے باوجود بھی ان کے ذریعہ دنیا میں وہی کشمکش اور منافرت کا زہر پھیلتا ہے جو ان کی اصلیت میں رکھا ہوا ہے؛ پھر جب دنیا ان کی زہر افشانیوں سے تنگ و مایوس ہو کر ان وطن وغیرہ کے نعروں سے ہٹنے لگتی ہے تو جھوٹے اور فریبی لوگ ان خامیوں اور ناکامیوں کو خدا اور مذہب کے سر ڈال کر خود بری ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف اسلام کے پاس اس عالمگیری اور بین الاقوامیت کا بالکل صحیح معقول اور منقول پروگرام موجود ہے، اس لئے نہ اسے دھوکہ دینے کی ضرورت ہے نہ دھوکہ کھانے کی؛ وہ کھلے عام دعویٰ کرتا ہے کہ عالم کے انتشار کا اصلی سبب ہی ان فرضی خداؤں، وطن و قوم اور نسل و رنگ کے سامنے سربسجود ہونا ہے جس کی ذات ہی میں حد بندی اور پھوٹ داخل ہے؛ اس لئے جب تک نسلی امتیازات، وطنی تفویقات اور قومی افتراقات مٹا نہیں دئے جائیں گے اس وقت تک یہ باہمی بد اعتمادی، منافرت، دھڑے بندی اور آپسی انتشار ختم نہیں ہو سکتے، جب تک کسی ایسے ایک مرکز سے وابستگی نہ ہوگی جس کے جوہر ہی سے فرقت، تعدد، تضاد، کثرت، حد بندی اور پھوٹ پھاٹ خارج ہو اس وقت تک عالم میں باہمی اتحاد، الفت، جذب و کشش اور آپسی میل ملاپ پیدا نہیں ہو سکتا؛ اور ایسی ذات صرف اللہ کی ذات بابرکت ہے، اس لئے اس نے ایک پروگرام تو منفی پہلو میں پیش کیا جس کی رو سے مخلوق میں انتشار و افتراق پیدا کرنے والی ہر غیر اللہ کی مرکزیت ختم ہو جاتی ہے؛ خواہ وہ وطن ہو، نسل ہو، قوم ہو، دولت ہو، حکومت ہو، صورت ہو، مورت ہو، اپنا نفس ہو یا عناصر و کواکب کے نفوس ہوں، کچھ بھی ہو ان کے آگے نہ کوئی انسان جھکے اور نہ کوئی قوم، نہ انہیں مرکز فکر بنائے، نہ انہیں غایت عمل بنائے، نہ ہی ان کی خاطر سے عملی مجاہدات کئے جائیں۔

اسی پہلو کی قدرے تفصیل میں نے مضمون کے شروع میں پیش کی تھی اور عرض کیا تھا کہ

جس کو فرقہ واریت اور دھڑا بندی کہتے ہیں وہ انہی فرضی دیوتاؤں کے سامنے جھکنے کا انخام ہیں، اس لئے اسلام نے وطنی فرقہ واریت، نسبی فرقہ واریت غرض ہر نوع کی فرقہ واریت کو جڑ بنیاد سے ختم کر کے خود ان مصنوعی مرکزوں کو ختم کر دیا ہے، تاکہ یہ دو ارب دنیا انتشار سے نجات پاسکے اور آپسی نفرت کے وبال سے چھٹکارا حاصل کر سکے؛ اس منفی پروگرام کی تفصیلات سے جن میں شرک اور تفرق کی جڑیں کاٹ دی گئی ہیں قرآن کی آیات اور سنت نبوی کی روایات بھری ہوئی ہیں جن کے گنانے کا یہ موقعہ نہیں۔

رہا اس پروگرام کا مثبت پہلو کہ ان فرضی مرکزوں سے بچ کر اصل مرکز سے وابستگی کا لائحہ عمل کیا ہے؟ بالفاظ دیگر شرک سے بچ کر توحید کامل اختیار کرنے کا دستور العمل کیا ہے؟ سو یہ پروگرام بھی اسلام ہی دنیا کو سکھلا سکتا ہے؛ کیوں کہ جو ماسوا سے قطع کرنے کی راہیں دکھلا سکتا ہے وہی اصل سے وابستہ کرنے کی تدبیریں بھی بتلا سکتا ہے، جو نظریے اور راستے ماسوا سے کٹنے کی راہیں ہی نہیں کھول سکے بلکہ انہوں نے انسانوں کو ماسوا ہی میں الجھائے رکھا ہے وہ اصل سے وابستہ کرنے کا دستور تو کیا بتا سکتے اس کی فکر بھی دماغوں میں نہیں ڈال سکتے ہیں، اس لئے یہ بات طے ہوگئی کہ جو نظریہ اور راستہ عالم کی اصل سے وابستہ کر سکتا ہے وہی عالمی نظام بھی دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور جو نظریے اور راستے عالم گیریت کے بجائے محدودیت، نسلیت، قومیت، وطنیت کے پروگرام رکھتے ہیں وہ عالم گیر نظام ہرگز پیش نہیں کر سکتے۔

اسلام نے تو اس مثبت پہلو کے سلسلے میں دنیا کے تمام انسانوں کو اس مرکز کائنات سے وابستہ کرنے کے عملی پروگرام سے پہلے فکر و خیال تک کو بھی اسی مرکز حقیقی سے جوڑنا چاہا، یعنی ملک و سلطنت ہی نہیں، عادی و عبادۃ ہی نہیں، فکر و خیال اور وہم و تصور میں بھی اللہ ہی کو بسایا ہے گویا فکر و خیال میں بھی غیر اللہ کا دھیان نہ آئے، امید ہو کہ خوف، رنج ہو کہ راحت، شوق ہو کہ وحشت، محبت ہو کہ عداوت، صلح ہو کہ جنگ، عزت ہو یا ذلت، نصرت ہو یا بے کسی،

سکون ہو یا تشویش، عادت ہو کہ عبادت، معاملت ہو یا معاشرت، سب میں رجوع ایک ہی طرف رکھا ہے، اس ایک کی طرف جو سب پر حاوی، سب کو شامل، سب پر غالب اور سب سے وسیع اور ہمہ گیر ہے؛ چنانچہ قرآن کی تعلیمات نے رہنمائی کی ہے:

اگر تمہیں عزت کا تصور ہو تو فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ پر دھیان کرو، اگر قوت و شوکت کا خیال آئے تو وَأَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ پر نظر کرو، اگر حکومت کا تصور بندھے تو إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ کو دیکھو اگر زمین جائداد کا دھیان آئے تو إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ پر دھیان جماد، اگر امید کا موقع ہو لَا تَيَاسُؤْا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ کا خیال کرو، اگر بے فکری کے جراثیم ستائیں تو لَا يَأْمَنْ مَكْرَ اللَّهِ کو فراموش نہ کرو، اگر نعمت سامنے آجائے تو مَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنْ اللَّهِ کو سوچو، اگر مصیبت چھا جائے تو مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ کو یاد کرو، صبر کا وقت آئے تو مَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ کو زیر نظر رکھو، ناز کی کیفیت ہو تو اتَّقُوا اللَّهَ کا پاس کرو، نیاز کا غلبہ ہو تو وَاَعْبُدُوا اللَّهَ کو پیش نظر رکھو، سکون قلب کی خواہش ہو تو لَا يَذِكرِ اللَّهَ کو یاد رکھو، نصرت و مدد مطلوب ہو تو مَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ کو محفوظ رکھو، دولت کی دھن ہو تو اتَّوَهُمْ مِنْ مَّالِ اللَّهِ کا دھیان باندھو، خرچ کا جذبہ ابھرے تو انْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ کو سامنے رکھو، محبت کا مقام آئے تو مَنْ أَحَبَّ فِي اللَّهِ کو نہ بھولو، عداوت کا موقع آئے تو مَنْ أَبْغَضَ فِي اللَّهِ کو ذہن نشین کرو، کوئی طاقت و سامنے آئے تو لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کو زیر نظر رکھو، نیکی بدی کی پیدائش کا سوال ہو تو كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ اللَّهِ کو پڑھو، جائز و ناجائز کی حدود کی بحث آئے تو تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ پر غور کرو، معاہدہ کرو تو أَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ کا خیال رکھو، راستی پر آؤ تو قُلْ صَدَقَ اللَّهُ کہو اور خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مخلص اخلاص برتے تو لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا تصور باندھے، اور جب کوئی متبع اتباع حق ادا کرے تو مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کا دھیان باندھے، غرض قلب و قالب کا کوئی بھی مقام ہو ہر موقع پر اسی ایک مرکز و جود کا تصور اسی ایک کی عقیدت اور اسی ایک کی طرف رجوع اسلام نے سکھایا ہے۔

اس لئے اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو اپنے منفی اور مثبت پہلوؤں کے لحاظ سے صرف مرکز کائنات (اللہ) کو اپنا منتہائے نظر اور منتہائے مقصود ٹھہراتا ہے اور وہی اس دنیا میں عالمی نظام قائم کر سکتا ہے جس سے فرقہ وارانہ حد بندیاں ختم ہو سکتی ہیں، نہ کہ وہ ازم اور نظریے جن کا منتہائے نظریہ یا توزمین کا کوئی محدود ٹکڑا ہوتا ہے یا انسانی برادری کا کوئی مخصوص طبقہ ہوتا ہے یا دولت و مال کا کوئی مخصوص حصہ ہوتا ہے، کیوں کہ ان میں وسعتِ نظر بھی پیدا نہیں ہو سکتی چہ جائے کہ ان کے قلوب میں کسی وسیع نظام اور عالم گیر انتظام کے فکری گنجائش ہو۔ اب اگر دنیا کی قومیں اسلام کے اس جمالی پروگرام پر آجائیں کہ خدا کو مرکزِ علم، مرکزِ فکر و خیال اور مرکزِ قول و عمل بنا کر ان متوازی خداؤں — وطن و قوم اور نفس و نفوس وغیرہ — کو دل سے ہٹادیں اور صرف اجمالی طور پر بھی اس کی توحیدِ عبادت پر آجائیں تو یہ ایک ایسا قدرِ مشترک ہوگا جو دنیا کی تمام اقوام کو ایک سطح پر لے آئے گا، زیادہ سے زیادہ وہ عملی پروگراموں کا فرق رہ جائے گا جس سے قوموں میں قومی خصوصیات قائم رہتی ہیں، مگر مرکزِ ایک ہو جانے کی وجہ سے یہ خصوصیات آپس میں ٹکرائے سکیں گی، اور ان میں وہ تصادم اور ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے گی جس سے فرقہ وارانہ کشیدگیوں کو پرورش پانے کا موقع ملتا ہے؛ دوسرے الفاظ میں حقیقی طور پر ایک مضبوط، مستحکم اور متحدہ قومیت قائم ہو جائے گی۔

اور اگر جمالی پہلو کے ساتھ اسلام کے تفصیلی پروگرام کو بھی تمام اقوام مقبول کر لیں — جس میں ہر فکر و عمل کا معیار اللہ کو قرار دیا گیا ہے اور ہر قول و فعل کے موقع پر قلب میں صرف یہی ایک کلمہ بسا دیا گیا ہے کہ اسی سے اخلاق کا تخلُّق ہو اور اسی سے عمل کا تعلق ہو اور جسم و جان اسی کے لئے مطیع و فرمانبردار بن جائیں — تو پھر دوئی ہی باقی نہ رہے گی جس سے فرقہ واریت کا احتمال بھی پیدا ہو۔ غرض وحدتِ امم کا مسئلہ ہو یا اتحادِ اقوام کا سوال اُن مصنوعی مرکزوں سے قائم ہی نہیں ہو سکتا جنہیں دنیا کی قومیں عالمی اور بین الاقوامی کہہ کہہ کر پیش کر رہی ہیں، بلکہ صرف اسلام ہی کے نظام سے قائم ہو سکتا ہے جس کے بعد عالمی نظام

کا نقشہ اس طرح بن سکتا ہے کہ ان کا پلیٹ فارم بھی عالمی ہو، ان کی حکومت بھی عالمی ہو، ان کی دیانت بھی عالمی ہو، اور سیاست بھی عالمی ہو، اور جو متعدد قومیں نہ ہوں بلکہ یا قوم متحدہ ہوں یا قوم واحد ہوں جس طرح ابتدائے آفرینش کے وقت وہ ایک ہی طریقہ اور ایک ہی دین پر تھے، اسی طرح وہ اب بھی سب مل کر ایک ہی راستہ پر آ جاسکتے ہیں۔

پس اسلام کی اصل بنیاد وحدت ہے فرقہ نہیں، جمع ہے تفریق نہیں، اجتماع ہے انقسام نہیں، اتحاد ہے فرقہ واریت نہیں، اس لئے فرقہ واریت سے بچنا چاہنے والوں کے لئے بلاشبہ ان مذاہب سے بچتے رہنے کی ضرورت ہے جو اپنی ابتداء ہی سے تفریقوں، تقسیموں، اونچ نیچ اور چھوت چھات وغیرہ سے دنیا کو فرقوں اور ذاتوں میں بانٹ کر عالمی ہونے کے تصور تک سے محروم کئے ہوئے ہیں؛ اس کے برخلاف جو مذہب آیا ہی فرقہ واریتوں کے مٹانے کے لئے اس سے جڑنا اور اسے اختیار کرنا چاہئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کی اقوام نے جس حد تک بھی فرقہ واریت سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اس حد تک انہوں نے اسلام بھی قبول کر لیا ہے، کیوں کہ فرقہ واریت کو ختم کرنا ذات پات اور اونچ نیچ کو مٹانا، چھوت چھات کے باطل نظرائے انسانوں کو ہٹانا، نسلی اور وطنی امتیازات کو منسوخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکنا اسلام کا بنیادی مقصد اور اولین اقدام ہے، اسلام ہی نے یہ خبر دی ہے کہ دنیا کے آخری دور میں وہی ان مصنوعی حد بندیوں کو دوبارہ ختم کرنے والا ہے۔

چنانچہ ”دلائل النبوة“ میں صریح حدیث موجود ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ خاتم النبیین ﷺ کا عالمی دین ہی بالآخر دنیا سے قومیت کے بت اور اس کی پرستش کو مٹا کر رکھے گا، اور عالم میں عالمی قومیت اور عالمی وحدت پیدا کر دے گا؛ کعب احبارؓ فرماتے ہیں:

ارض بابل سے بنی اسرائیل کے چھٹکارے کا سبب بخت نصر — بادشاہ عراق — کا خواب ہوا، بخت نصر نے شام پر فوج کشی کر کے بنی اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا، ہزاروں کو قتل کیا اور ہزاروں کو قیدی اور غلام بنا کر عراق لے آیا، گرفتار شدگان میں وقت کے

پیغمبر حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے جو عراق کی جیل میں ڈال دئے گئے، ان کی دیانت و امانت، راست بازی، صدق و صفائی اور عبادت و زہد کو دیکھ کر جیل کے حکام ان کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے، اور ان کے ساتھ بہت ہی احترام سے پیش آنے لگے؛ اس حالت پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس سے اس کے دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی؛ اس نے دربار کے کاہنوں اور جادوگروں کو طلب کیا اور اپنی فتلیبی بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے — جو اس غیر معمولی خواب سے پیدا ہوئی تھی — ان سے خواب کی تعبیر طلب کی؛ انہوں نے کہا کہ خواب بیان کیجئے کہ کیا دیکھا ہے؟ اس نے کہا کہ خواب تو مجھے یاد نہیں رہا، جادوگروں نے جواب میں پوچھا کہ پھر تعبیر ہم کیسے بتلائیں؟ بادشاہ نے غضب ناک ہو کر کہا میں نے تمہیں اسی قسم کے امور کے انکشاف کے لئے تو دربار میں اس مرتبے تک پہنچایا اور اپنا مقرب بنایا تھا، جب تم ایسے امور کا بھی انکشاف نہیں کر سکتے تو تم کس مرض کی دوا ہو؟ جاؤ تمہیں تین دن کی مہلت ہے، اگر تم نے اس مدت میں میرا خواب اور اس کی تعبیر بتلا دی تو ٹھیک ہے ورنہ تم سب قتل کر دئے جاؤ گے۔

اس واقعہ کا ملک میں چرچہ ہو گیا، ہوتے ہوتے یہ خبر جیل میں بھی پہنچی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے کان میں پڑی، آپ علیہ السلام نے جیلر سے فرمایا — جو ان کا بہت زیادہ معتقد اور محسن تھا — کیا یہ ممکن ہے کہ تم بادشاہ کے سامنے میرا تذکرہ کر دو؟ کیوں کہ میرے پاس اس خواب کا علم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے بادشاہ کے یہاں تمہارا مرتبہ اور منصب بڑھ جائے گا، اور میرے لئے رہائی کی صورت نکل آئے گی، جس سے میری قوم بھی اس قید و بند کے عذاب سے چھٹکارا پاس کے گی؛ جیلر نے کہا ”مجھے آپ کے بارے میں بادشاہ کے بے پناہ غصے کا ڈر ہے، وہ یہ نہ سمجھے کہ کہیں آپ جیل کے مصائب سے چھوٹنے کے لئے یہ دعویٰ کر رہے ہوں، حالانکہ میں بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ کے اس فراموش شدہ خواب کا علم ہو سکتا ہے تو وہ صرف آپ ہی کی ذات ہے؛ فرمایا: تم میرا خوف نہ

کھاؤ اور بے فکر ہو کر بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دو، میں اس کے خواب اور تعبیر خواب کو قطعی طور پر جانتا ہوں، جس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جو مجھے اُن باتوں کی خبریں دیدیتا ہے جن کو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں؛ مختصر یہ کہ جیلر نے بادشاہ سے جا کر اس کا تذکرہ کر دیا، بادشاہ نے اسی وقت حضرت دانیال علیہ السلام کو دربار میں طلب کر لیا اور وہ فوراً شاہی دربار تک پہنچا دئے گئے؛ دربار کا ضابطہ تھا کہ اندر داخل ہونے والا بادشاہ کو سجدہ کرے، حضرت دانیال علیہ السلام دربار میں داخل ہو کر کھڑے رہے مگر سجدہ نہیں کیا، تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے دربار برخاست کیا، موجود لوگوں کو روانہ کر کے تخلیہ میں حضرت دانیال علیہ السلام سے گفتگو شروع کی۔

سب سے پہلے پوچھا کہ آداب دربار کے مطابق آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جس نے مجھے خواب اور اس کی تعبیر کا علم اس شرط پر عطا کیا ہے کہ میں اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کروں، میں اس رب سے ڈرتا ہوں کہ میں تجھے سجدہ کروں گا تو وہ اسی وقت یہ علم مجھ سے چھین لے گا، پھر تو میں خواب نہ بتلانے کی وجہ سے تیرے ہاتھ میں قیدی بن کر رہ جاؤں گا، اور جب تو مجھ سے اس علم کا فائدہ نہ اٹھا سکے گا تو مجھے قتل کر ڈالے گا؛ اس لئے میں نے سجدہ نہ کرنے کو اپنے قتل ہو جانے سے آسان سمجھا، اسی طرح سجدہ نہ کرنے کے خطرہ کو اس خطرہ سے ہلکا سمجھا کہ تو ساری عمر اسی بے چینی میں مبتلا رہے جس میں فراموش شدہ خواب کی وجہ سے اب مبتلا ہے، اس طرح میں نے تجھے سجدہ نہ کر کے تجھے بھی اور اپنے کو بھی بڑے نقصان سے بچا لیا ہے؛ بخت نصر نے کہا کہ میرے نزدیک تجھ سے زیادہ اپنے الہ و معبود کا وفادار کوئی اور نہیں، اور بلاشبہ وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے رب کے عہد و میثاق کو پورا کرتے اور اس کے وفادار رہتے ہیں۔

خیر! اب بتلاؤ کہ تمہارے پاس میرے خواب اور اس کی تعبیر کا علم ہے؟ حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا: ہاں ہے، وہ یہ کہ تو نے خواب میں دیکھا تھا کہ زمین و آسمان کے

درمیان ایک عظیم الشان بت لٹکا ہوا ہے جس کے عظیم الشان جسم نے تمام فضا کو گھیر رکھا ہے، اس کے پیر زمین میں ہیں اور سر آسمان میں، اس بت کے اوپر کا حصہ سونے کا ہے، درمیانی حصہ چاندی کا ہے اور نچلا حصہ تانبے کا ہے، پیر لوہے کے ہیں اور قدم مٹی کے ہیں؛ تو اس کی خوب صورتی، حسن و جمال اور بے نظیر بناوٹ کو حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک زبردست پتھر گرا اور اس بت پر آ کر اس زور سے پڑا کہ وہ سرمہ کی طرح پس کر رہ گیا؛ اور اس کا سونا، چاندی، تانبا، لوہا اور مٹی سب اس طرح خلط ملط اور ڈھیر ہو گئے کہ یہ سب دھاتیں رل رل کر ایک ذات ہو گئیں، اور کوئی دھات دوسری سے ممتاز اور جدا نہ رہی، اور تو اس یقین پر پہنچ گیا کہ اب اگر دنیا کے تمام انسان اور جن بھی جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ان دھاتوں کو الگ الگ کر دیں تو ہرگز نہیں کر سکتے؛ اگر اس حالت میں ہوا چل جائے تو ہوا بھی ان ذرات کو بہ آسانی اڑا سکتی ہے؛ اسی حالت میں تو نے دیکھا کہ وہ آسمان سے گرنے والا پتھر اس بت کو پس دینے کے بعد اچانک فضا میں خود پھیلنا شروع ہوا، اور پھیلتے پھیلتے اتنا بڑا ہو گیا کہ پوری زمین پر چھا گیا، اور زمین اس کے اندر چھپ گئی، یہاں تک کہ اب آسمان اور اس پتھر کے سوا تجھے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بخت نصر نے کہا: بالکل درست ہے، یہی تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا؛ اچھا اب اس کی تعبیر فرمائیے!

حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا: وہ بت دنیا کی مختلف قومیں ہیں جو دنیا کے اول و آخر اور درمیانی زمانوں میں مختلف درجات و مراتب کی ساتھ آچکیں اور جو آئندہ آئیں گی اور جو اب موجود ہیں، اس بت کے سونے کا حصہ تو یہ موجودہ دور اور تیری قوم ہے جس پر تو حکم رانی کر رہا ہے، اور چاندی کا حصہ تیرے بعد کی قوم ہے جس پر تیرا بیٹا حکم رانی کرے گا، اور تانبے کا حصہ رومی قوم ہے، اور لوہے کا حصہ فارسی قوم ہے اور مٹی کا حصہ دو اور قومیں ہیں جن پر دو عورتیں حکم رانی کریں گی، ایک مشرقی یمن میں اور ایک مغربی شام میں، اور وہ پتھر جو اس خوش نمابت کے سر پر آسمان سے پھینک کر مارا گیا وہ اللہ کا دین ہے جس کو آخری زمانہ میں

نبی آخر الزماں لے کر آویں گے اور ان کی امت اسے قومیتوں کے بت پر پھینک کر مارے گی تاکہ اس دین کو تمام اقوام کے ادیان پر غالب کر دے اور قومیتوں کی اس اونچ نیچ کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دے۔

پس اللہ تعالیٰ ایک نبی اُمّی کو عرب میں مبعوث کرے گا جو تمام امتوں، قومیتوں اور ایک دوسرے سے ٹکرانے والے تمام مذہبوں کو توڑ پھوڑ کر اسی طرح ایک مذہب بنا دے گا جس طرح اس پتھر نے بت کی تمام الگ الگ دھاتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک کر دیا، اور پھر وہ آخری دین اسی طرح پوری دنیا میں پھیل جائے گا جس طرح وہ پتھر تمام دھاتوں کو ایک ذات کر کے خود ساری فضا میں چھا گیا؛ حق تعالیٰ اس طرح اپنے دین کو غالب کر دے گا، باطل کا سر نیچا ہو جائے گا، راہ ہدایت سامنے آجائے گی، گم راہی ختم ہو جائے گی، اللہ امیوں کو اس دین کی تعلیم دے گا اور اس کے ذریعہ کمزوروں کو جنہیں اچھوت بنا دیا گیا تھا قوت عطا کرے گا، ذلیل اس سے عزت پائیں گے اور کمزوروں کی اس سے مدد ہوگی۔

بادشاہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے انتہائی عقیدت سے عرض کیا کہ میں نے جب سے سلطنت سنبھالی ہے میری نظر سے آپ جیسا شخص نہیں گزرا، جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی کسی کیفیت دہشت و بے چینی کو اس طرح چھانٹ دیا ہو جس طرح آپ نے ایک ایک بات کی وضاحت کر کے چھانٹ دیا ہے، آج سے میرے دربار میں آپ سے زیادہ مرتبے والا کوئی شخص نہ ہوگا، میں آپ کو اس احسانِ عظیم کی قدر میں یہی صلہ دیتا ہوں.... الخ

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ خاتم النبیین ﷺ کا دین جو دنیا کے آخری دور میں ظاہر ہوگا — اور جیسا کہ ظاہر ہو چکا ہے — ان تمام قومی، نسلی اور وطنی امتیازات کو پاش پاش کر ڈالے گا، اور تمام قومیتیں اور اونچی نیچی ذاتیں رمل کر ایک ذات ہو جائیں گی، چھوت چھات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ قومیں جن کا مذہب ہی اونچ نیچ اور چھوت چھات پر مبنی تھا خود اپنے اس مذہب سے بیزار ہونے لگیں گی، سارے رجعت

پسند لیڈر مل کر بھی اگر ان امتیازات کو پھر لوٹانا چاہیں گے تو لوٹا نہیں سکیں گے اور اس طرح پوری دنیا میں ایک قوم ہوگی، ایک ازم ہوگا اور دنیا کی اس واحد قوم کی عالمی حکومت ہوگی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام نے ایک اسلامی رشتہ قائم کر دینے کے بعد انسانیت، وطنیت اور نسبت وغیرہ کے تمام رشتوں کو بالکل لغو اور باطل قرار دے دیا ہے یا ان کا کوئی بھی اعتبار نہیں کیا، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس نے ان رشتوں اور نوعیتوں کو بھی حدود کے ساتھ قائم رکھا اور ان کا اعتبار کیا ہے، کیوں کہ ان رشتوں کی طرف بھی انسانی فطرت میں قدرتی میلان اور کشش موجود ہے، اور غیر جنس کے مقابلے یا خطرے کے وقت اس رابطہ کا جذبہ ابھر آتا ہے؛ مثلاً اگر چند انسانوں پر کوئی درندہ یا درندہ صفت انسان حملہ آور ہو تو طبعاً یہ انسانیت کا رشتہ انہیں حیوانیت کے مقابلے کے لئے متحد کر دے گا؛ اگر ایک وطن کے باشندوں کا کسی غیر وطنی دشمن سے سابقہ پڑ جائے تو یہ وطنیت کا رشتہ طبعی طور پر غیر ملکیوں کے مقابلہ پر انہیں جوڑ دے گا؛ اگر ایک خاندان پر کوئی دوسرا خاندان ناحق زیادتی اور بے جا تشدد کرنے لگے تو طبعی طور پر یہ نسب رشتہ ان کے درمیان یگانگت پیدا کر دے گا؛ ظاہر ہے کہ یہ جذبات انسانی فطرت میں پیوست ہیں اور اسلام طبعی اور فطری جذبات کو پامال کرنے کے لئے نہیں، انہیں استوار کرنے کے لئے آیا ہے تو ممکن نہ تھا کہ وہ ان تقاضوں سے ایک دم صرف نظر کر لیتا، اس لئے اس نے ان رشتوں کو باقی رکھ کر اندرونِ حدود ان سے کام لیا ہے، مگر ان سب کے استعمال اور حدود استعمال کا معیار دین اور للہیت کو ٹھہرایا۔

اسلامی اخوت کے بارے میں اس کا مشہور اعلان کتاب الہی میں موجود ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰) ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حدیث نبوی میں فرمایا گیا:

المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا
يخذله ولا يحقره (ترمذی: ۲۸۶۴) پر ظلم کرے، نہ اُسے رسوا کرے، اور نہ
اس کی تحقیر کرے۔

انسانی اخوت کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ
ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ (الحجرات: ۱۳) اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک
عورت سے پیدا کیا۔

اسی حقیقت کو زبانِ نبوت نے یوں ظاہر فرمایا:
أَنَا شَهِيدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ
(سنن ابی داؤد: ۱۵۰۸) میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انسان
آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک ماں باپ کی اولاد بھائی بھائی ہی کہلاتی ہے۔
نسلی اور نسبی اخوت کے بارے میں مسلمانوں اور یہودی مدینہ کے درمیان کیا گیا معاہدہ
کافی حجت ہے، جس میں مشرکین مکہ کے مقابلے پر — جو اس وقت اہل مدینہ کے لئے
غیر ملکی دشمن کی حیثیت میں تھے — مسلمان اور یہودی وطنی رشتے سے ملے اور باہم ایک
قوم بن گئے، ورنہ مسلمانوں اور یہودیوں میں نہ کوئی مذہبی رشتہ تھا نہ خاندانی ربط تھا، سوائے
وطن کے اور کوئی بھی رشتہ ان میں موجود نہ تھا۔

نسبی اور خاندانی اخوت کے بارے میں قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا:
وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ
لِتَعَارَفُوا (الحجرات: ۱۳) اور تمہیں شاخوں اور خاندانوں میں اس
لئے بانٹ دیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو
پہچان سکو۔

ظاہر ہے کہ خاندان اور قبیلوں کی دل جمعی اور تسلی اپنے خاندان کے افراد ہی سے ہو سکتی
تھی کسی اور سے نہیں، اس لئے خاندان قبیلے کا امتیاز اور پہچان باقی رکھا، مگر ان سب اخوتوں کا

معیار اور مصرف بالآخر دین قرار دیا گیا، تاکہ یہ وطنی، نسلی اور قومی تعصبات تفریقوں اور گروہ بندیوں کا باعث نہ ہو جائیں؛ یعنی ان تمام رشتوں کو نہ مدارِ نجات قرار دیا نہ معاملات باہمی کی مستقل بنیادیں ٹھہرایا گیا، بلکہ ان ساری بنیادوں کو دین اور اسلامی اخوت کے لئے معین اور مددگار بنایا گیا ہے۔

چنانچہ نسبی اخوت سے نبی کریم ﷺ نے اسلام اور اس کی تبلیغ کو مستحکم اور پائے دار بنانے کا کام لیا، آپ کی سچی زبان سے قرآن نے اعلان کرایا:

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا
 الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ط
 اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے
 اس کا تبلیغ اور اشاعت دین پر کوئی اجرت
 سوائے اس کے نہیں چاہتا کہ محبتِ قرابت
 کی رعایت رکھو۔ (سورۃ الشوری: ۲۳)

خاندانِ قریش کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا کہ جس میں آپ ﷺ کی رشتہ داری موجود نہ ہو، اور رشتے کے ذریعہ ربط باہمی اور ایک دوسرے کی رعایت فطری امر ہے، اس لئے آپ ﷺ نے تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں اس نسبی اخوت سے کام لیا، اور اس کا حوالہ دے کر فرمایا کہ میرے بھائیو! مجھے تبلیغ کرنے دو اور کم از کم بھائی بندگی اور رشتہ داری کے خیال ہی سے ہی میرے کارِ منصبی میں رکاوٹ مت ڈالو؛ چنانچہ بہت سے لوگ اس خاندانی اشتراک کی وجہ سے آپ کے ساتھی اور معین و مددگار ہوئے، اور بالآخر اسلام سے مشرف ہو گئے جو اسلام میں اس اخوت کا حقیقی مقصد تھا؛ انسانی اخوت سے بھی عالم گیر دین کے پھیلاؤ ہی میں مدد لی گئی، اور تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ کا پیغام عام انسانی برادری کو سنایا گیا، یعنی انسانیت کے نام پر اکٹھا کر کے انہیں انسانیت کے فرائض یاد دلانے گئے تاکہ وہ اس طبعی جذبے سے شرعی جذبے کی طرف آجائیں؛ وطنی اخوت سے بھی دینی بچاؤ اور تحفظِ اسلام ہی کا کام لیا گیا، جیسا کہ یہود سے معاہدہ صرف اسلام ہی کو محفوظ رکھنے کے لئے کیا گیا تھا۔

غرض شرعی اخوت اصل اور معیار بنائی گئی اور یہ دوسری طبعی اخوتیں اس کے خادم کی حیثیت سے استعمال کی گئیں، نہ انہیں اصل اور بنیاد بنایا گیا اور نہ بالکل بے اعتبار ٹھہرایا گیا، یعنی دین کو عالمی رشتہ بنایا گیا، اور محدود رشتے اس کی شاخوں اور فروع کے طور پر اس کی تقویت کے لئے باقی رکھے گئے اور ان رشتوں کی حدود و شرائط کی دین میں تفصیلی احکام بیان کئے گئے؛ اسلامی اخوت کے ممتاز لوازم میں آپسی محبت و دوستی کو شمار کیا گیا ہے؛ انسانی اخوت کے اعلیٰ لوازم میں رحم و کرم کو گنا گیا ہے؛ نسبی اخوت کا اعلیٰ مقام صلہ رحمی اور احسان و سلوک کو قرار دیا گیا؛ اور وطنی اخوت کے لوازم میں سب سے اونچا مقام ایک دوسرے کو تکلیف سے بچانا اور امن و سلامتی قائم رکھنا بتلایا گیا ہے؛ تاکہ ہر دائرے کی زندگی اس کے مناسب خصوصیات سے پر کیف اور پرسکون گزرے، اور ساتھ ہی زندگی کا اصل مقصد یعنی دین پر چلنا، دین پھیلانا اور حق تعالیٰ کی بڑائی کے گن گانا بہ آسانی حاصل ہوتا رہے، اس لئے اسلامی اخوت اور اس کے عالم گیر ہونے پر زور دینے کا مطلب — جو اس حدیث کعب احبار کا موضوع ہے — ان طبعی رشتوں کا بے کار محض یا بے اعتبار محض ہونا نہ سمجھ لیا جائے۔

خواب کی تعبیری وضاحت

حدیث میں پتھر اور ریت کی مثال سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ خدا کے اس آخری دین میں مذاہب باطلہ کی سی رسوم، وضع بندیاں، اور رنگ و روپ نہ ہوں گے؛ بلکہ وہ ایسی فطری شکل اور طبعی صورت لے کر آئے گا جو رسم و رواج سے بالاتر ہوگی؛ سادہ، قدرتی اور پورے دین کی وحدانی صورت ہوگی، جیسے خواب میں اس گرنے والے پتھر کی صورت بت کی دھاتوں سے ڈھلی ہوئی صورت نہ تھی اور نہ ہی اس میں دھاتوں کا سارنگ و روپ تھا اور نہ ہی اس میں رنگوں کی اونچ نیچ تھی، بلکہ اس کی اپنی طبعی شکل تھی، سادگی تھی اور شکل میں وحدانیت تھی؛ گویا عالم مثال میں بھی فرقوں اور قومیتوں کے بت اور اس کے اعضاء توڑنے کے لئے کوئی ہتوڑہ یا گرز وغیرہ کی صورت نہیں دکھائی گئی، بلکہ حد بندیوں اور شکل و صورت سے بالاتر

فطری اور سادہ شکل نمایاں کی گئی، جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ آخری دین جس کے ذریعہ بناوٹی رسم و رواج اور فرقہ واریت مٹائی جائے گی، رسوم و رواج کی مروجہ صورتوں کا دین نہ ہوگا، بلکہ ہر حد بندی سے بالاتر ہو کر اور قدرتی سادگی لے کر آئے گا، ساتھ ہی پتھر کے آسمان سے اترنے اور بت کے فضا میں معلق ہونے میں ادھر اشارہ ہے کہ قومیتوں کی اونچ نیچ کا تصور اور فرقہ وارانہ مذاہب بے بنیاد اور ہوائی ہیں جن کی نہ کوئی حبڑ ہوگی نہ کوئی اساس ہوگی جس پر وہ ٹکا ہوا ہو، بلکہ محض قوموں کے غلبہ و مغلوبیت اور زبردستی کے معیار سے پیدا شدہ بے بنیاد مذاہب ہوتے ہیں جو انسان کے محدود تصور و خیالات سے ایک حسین و رنگین شکل اختیار کر لیتے ہیں، البتہ اسے پاش پاش کرنے والا مذہب آسمانی ہوگا جو آسمان سے اترے گا اور اس کی جڑ بنیاد وحی آسمانی ہوگی، ساتھ ہی ان نسلی اور قومی مذہبوں کو بت کی صورت میں اور آسمانی مذہب کو پتھر کی صورت میں پیش کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آسمانی مذہب کا کام بت شکنی ہے اور زمینی مذاہب کا کام بت سازی ہے، یعنی آسمانی مذہب بندوں کو غیر اللہ سے کاٹ کر اللہ سے جوڑنے کا کام کرتا ہے، اور زمینی مذاہب جو آسمان سے نہیں اتارے گئے وہ بندوں کو اللہ سے کاٹ کر مخلوق سے جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔

بہر حال اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ انبیاء سابقین بھی اس کی پیشین گوئی کرتے آ رہے تھے کہ اسلام کا نصب العین قومیتوں کے ان رنگوں اور رنگین بتوں کو توڑ ڈالنا ہے جو دنیا میں اونچ نیچ پیدا کر کے بالآخر فرقہ وارانہ کشاکش کی بنیادیں ڈالنے کا باعث ہو گئے ہیں، اور مخلوق خدا کو سینکڑوں کنہوں میں بانٹ کر ان کے درمیان نفرت و تعصب قائم کر دئے ہیں، جس سے کچھ قومیں ہمیشہ کے لئے اونچ اور کچھ قومیں نیچ ہو گئی ہیں، کوئی سر کی اولاد اور سونا بن گیا اور کوئی پیر کی اولاد اور مٹی بن گیا، اس طرح وہ انسانی کنہ جو اپنی انسانیت میں مساوی اور یکساں سلوک کا متقاضی تھا اونچ نیچ کی نظر ہو کر آپسی نفرت اور دoriوں کا شکار ہو گیا، جس سے دنیا میں فتنہ و فساد کی آگ پھیل گئی۔

اگر آج کی دنیا اس قسم کے توڑ اور نفرت پیدا کرنے والے مذاہب سے تنگ آ کر مذہب سے الگ ہوگئی اور قومیت وطن وغیرہ کے نام پر جداگانہ امتیازات قائم کرنے کے لئے مجبور ہوگئی ہے تو وہ بلاشبہ معذور ہے مگر اسے کبھی بھی کوئی عمومی خوش حالی نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس قسم کے فرقہ پرور مذہب کا بانکاٹ کر کے دنیا سے انہیں نیست و نابود نہ کر دے؛ لیکن دنیا نے مرض کو صحیح سمجھ جانے کے باوجود جو علاج تجویز کیا ہے وہ عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے؛ کیوں کہ مذہب کی جگہ وطن اور قوم وغیرہ کو رکھ دینے سے فرقہ واریت کا خاتمہ نہیں ہوتا، بلکہ صرف فرقہ واریت کا رنگ بدل جاتا ہے، مذہبی فرقہ واریت کے بجائے وطنی، نسلی، قومی اور مالی فرقہ واریت آ جاتی ہے، اور وہی نفرت انگیز اونچ نیچ بدستور قائم رہتی ہے، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بھیا تک اور مہلک شکل میں آ جاتی ہے، جس سے پوری دنیا کا امن و سکون خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

اس لئے اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ صرف اسی مسلک اور ازم کو اپنایا جائے جس کا سنگِ بنیاد ہی اس فرقہ وارانہ اونچ نیچ کو مٹانے پر رکھا گیا ہو؛ اور اس نے مذہبی، نسلی، قومی، مالی، سیاسی اور وطنی اونچ نیچ کو مٹا کر پوری دنیا کو باہمی مساوات اور عالمی اخوت کا درس دیا ہو؛ اور ان فرقہ پرور حد بندیوں کے معیاروں کو ختم کر کے صرف انسانیت کے معیار پر پوری دنیا کو ایک سطح پر لا کھڑا کر دیا ہو، اس نے بڑائی، چھوٹائی کا اگر اعتبار بھی کیا ہے تو صرف اس حد تک جو کسبِ کمال سے پیدا ہو کر خود بہ خود انسانوں کے دلوں میں گھر کر لے اور انسانوں کو بلا کسی دباؤ کے اسے قبول کر لینے پر فطری طور پر مجبور کر دے؛ جیسے عالم کی غیر عالم پر، متقی کی غیر متقی پر پارسا کی غیر پارسا پر فوقیت کو بلا کسی دباؤ خود بہ خود آدمی کا دل قبول کر لیتا ہے، ان میں با کمال با عزت ہو جاتا ہے اور بے کمال بے وقعت، یہ ذات پات کی اونچ نیچ نہیں ہے جو غیر فطری ہے، یہ صرف فرق مراتب ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے؛ اس لئے میں نے ابتداء تقریر میں دعویٰ کیا تھا کہ اس ملک میں با عزت زندگی صرف خدا

کے اس فطری قانون ہی کے زیرِ سایہ رہ کر میسر آ سکتی ہے نہ کہ اس سے الگ ہو کر۔ الحمد للہ اس تفصیل کے بعد یہ دعویٰ مدلل ہو گیا۔

بقیہ سوالوں کا جواب

خدا کے فطری قانون ہی سے امن اور رزق کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے جو آپ کی خواہشوں میں سے ایک اہم اور قدرتی خواہش ہے؛ رزق کے سلسلے میں ظاہری رزق روٹی اور معنوی رزق عزت و اقتدار ہے، اس لئے امن و رزق کے عنوان میں روٹی اور کرسی دونوں شامل ہیں، آج ساری دنیا میں اسی امن و رزق یعنی روٹی اور اقتدار کا رونا ریا جا رہا ہے؛ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ملک پھر دنیا کی عام قومیں اور حکومتیں، حکمراں اور رعایا ہر جگہ روٹی کو رو رہی ہیں، اقتدار کو بسور رہی ہیں اور امن کا ماتم کر رہی ہیں؛ آپ غور کریں تو ان تینوں باتوں کا حل بھی اسی سابقہ پروگرام میں موجود ہے، اس کے لئے اس تقریر کے ابتدائی اجزاء کو ذہن میں ملا کر غور کیجئے کہ جب ایک قوم ہر قسم کی فرقہ واریتوں کو خیر باد کہتے ہوئے تمام اقوام اور ان کے مقتداؤں کی توقیر کرتی ہے، کسی کی ادنیٰ توہین گوارا نہیں کرتی، جس سے تمام اقوام کے قلوب اس کی طرف مائل ہیں، پھر وہ خود اپنی بادشاہت نہیں چاہتی بلکہ صرف اپنے خدا کی عظمت و جلال کو نمایاں رکھنا چاہتی ہے، قانون خداوندی پر عمل پیرا ہے جو عملی طور پر اپنے مالک کی شکرگزاری اور اعترافِ احسان ہے، جس سے مالک کی توجہات بھی اس کی طرف ہو جاتی ہیں، پھر اس نے اپنے اندرونی طبقات میں بھی افراط و تفریط اور اونچ نیچ کے بجائے طبقاتی توازن قائم کیا ہوا ہے، اس کا اقتصادی نظام بھی اونچ نیچ سے بری ہے، مالی حیثیت اس درجہ متوازن ہے کہ معاشی تغلب ہے نہ تاجروں میں بلیک میلنگ کا جذبہ ہے، نہ چوروں کے جذباتِ حرص بھڑکے ہوئے ہیں نہ ڈاکوؤں کے جذباتِ ہوس ابھرے ہوئے ہیں؛ پھر نسلی اور نسبی حیثیت سے بھی اس میں اونچ نیچ نہیں ہے، نہ نسلی امتیازات کے مد میں دنیا کو وہ مٹچھ اور کم ذات سمجھے ہوئے ہے، جس سے ایک طبقے کو دوسرے طبقے یا ایک قوم کو

دوسری قوم کے خلاف نفرت پیدا ہو، نہ سیاست میں پارٹی سسٹم کے عناد پرور تفرقے ہیں جس سے سیاسی فرقہ واریت کا تصادم نمایاں ہو، نہ ہی اس میں وطنی حیثیت سے ملکی غیر ملکی کی تفریق اور صوبائی عصبیت ہے جو خود ان کے درمیان یا ان میں اور دوسری اقوام میں منافرت اور کشیدگی پیدا کرے، تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ کوئی قوم یا کوئی طبقہ اس پر اندرونی طور پر یا بیرونی طور پر رزق و عزت کا دروازہ بند کرے، یا اس کے امن کا دیوالیہ نکالنے پر ٹل جائے، کیوں کہ ایک دوسرے پر امن اور رزق کے دروازے ناقدری اور تنگ حوصلگی، کم ظرفی، حسد و عناد اور کفرانِ نعمت سے بند ہوتے ہیں، اور جب قوم میں ان اسباب کا وجود ہی نہیں تو پھر تنگی رزق اور فقدانِ عزت و وقار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح خدا کی نعمتوں کا انکار اس کے قانون کو ٹھکرانا اس کے برگزیدہ بندوں کی توہین کرنا اور ان کی لائی ہوئی ہدایتوں کی ناقدری اور ناشکری کرنا بھی جب اس قوم میں موجود نہیں ہے تو پھر خدا تعالیٰ بھی اپنی رحمت و نصرت کے دروازے کیوں اس قوم پر بند فرمائے گا کہ جس سے یہ قوم بے روزگار اور بے عزت و بے وقار بنے؟ نیز جب اس کے اندرونی طبقات میں معاشی توازن ہے، سرمایہ داری اور ناداری کا مقابلہ ٹھنا ہوا نہیں ہے، ناداروں کے حقوق ادا ہو رہے ہیں اور انہیں مال داروں سے کوئی پر خاش نہیں ہے تو اس قوم میں رزق کی طرف سے بے چینی یا طبقاتی کشمکش سے ایک دوسرے کی بے عزتی کے جذبات کیوں پیدا ہوں؟ جس سے بدامنی یا بے رزقی کے جرائم کو پرورش پانے کا موقع ملے۔

غرض! نعمتوں کی اصل حقیقتاً دو ہی نعمتیں ہیں، نعمتِ امن اور نعمتِ رزق کہ ان دونوں ہی کے فقدان سے جان ہلاکت میں اور آبرو و خطرے میں پڑ جاتی ہے اور ان دونوں نعمتوں کی بنیاد شکر و قدر دانی اور اعترافِ احسان پر ہے، اس لئے شکر و اعترافِ نعمت تو تمام نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے اور کفرانِ نعمت تمام نعمتوں کے سلب ہو جانے اور چھن جانے کا سبب نکل آتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی حقیقت کو اپنے ان حکیمانہ الفاظ میں اس طرح ارشاد

فرمایا ہے:

وَصَرَبَ اللَّهُ مَغْلًا قَرْيَةً كَانَتْ
أَمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيَهَا رِزْقُهَا رَغَدًا
مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ
فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ
وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۱۳﴾

اور اللہ تعالیٰ (وبال کفر سے ڈرانے کے
لئے) ایک بستی والوں کی حالتِ عجیبہ
بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن و
اطمینان میں رہتے تھے اور ان کے کھانے
پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار

(سورۃ النحل)
طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں
سو انہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری
کی؛ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان حرکات
کے سبب ایک زبردست قحط اور خوف کا
مزمہ چکھایا۔

جس کا حاصل مضمون یہ ہے کہ ایک بستی امن و رزق کی بستی تھی جسے ہر سمت سے رزق
مل رہا تھا، ہر ملک سے جہاز اور ریلیں غلے سے لدے ہوئے چلے آ رہے تھے، گویا قومیں اپنا
سرمایہ اجناس اس کے لئے کھلے دل سے پیش کر رہی تھیں، کسی قوم میں اس کے خلاف بد امنی
اور بے اطمینانی کے جذبات نہ تھے، بلکہ ہر ملک اور ہر قوم اس کے حق میں معین و مددگار
بنے ہوئے تھے، اچانک یہ بستی کفرانِ نعمت کا شکار ہوئی، خدا کی ناشکری کی، نافرمانی کر کے
اس پر بھروسہ چھوڑا، اس کی رزاقی پر اعتماد کرنے کے بجائے خود ہی رزاق بن بیٹھی اور اللہ تعالیٰ
کے انعامات پر غرور اور گھمنڈ کرنا شروع کر دیا، دیگر اقوام کی بھی ناشکری کی، ان کی توہین کی،
ان کے مذہب کی توہین کی، ان کے مقتداؤ کی توہین کی، ان کے وطنوں کی توہین کی جہاں
سے رزق مل رہا تھا، پھر خود اپنے قوم کے افراد کی بھی توہین کی کہ ان میں اونچ نیچ پیدا کی، ان
میں سرمایہ داری کا تفاوت قائم کیا، اور ان میں پھوٹ اور بغضِ باہمی کے جذبات بھر دئے

اور جہاں سے امن کا سرچشمہ پھوٹتا تھا وہاں سے نفرتِ باہمی کے سوتے ایلنے لگے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بنیادی نعمتیں — رزق اور امن — اس بستی سے نکل گئیں اور بدامنی اور بے رزقی لباس بن کر اسے چٹ گئی؛ لباس کا خاصہ ہے کہ گھبراہٹ میں اگر اسے اتارنے کی بھی کوشش کی جائے گی تو وہ اور زیادہ بدن کو چٹ جاتا ہے، بلکہ جتنا اس سے بھاگتے ہیں اتنا ہی وہ بدن سے پیوست ہوتا جاتا ہے، اور اگر سکون کے ساتھ بھی اسے بدن سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو بھی آسانی سے جدا نہیں ہوتا؛ اسی طرح بدامنی اور بے رزقی اس ناشکری بستی کو لباس کی طرح گویا چپک کر رہ گئی ہے، اسے چھوڑنا بھی چاہتے ہیں تو نہیں چھوڑتی، اسی لئے قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ خدا نے اس بستی سے امن و رزق چھین لیا، بلکہ یہ فرمایا کہ بدامنی بے رزقی انہیں لباس بن کر چپک گئی، اور نہ صرف یہی بلکہ بھوک اور خوف غذا بن کر ان کے اندر اتر گئی ہے، جس کا مزہ بھی وہ چک رہے ہیں؛ اس داخلی و خارجی عذاب سے لوگ بھاگنا بھی چاہتے ہیں تو وہ پیچھا نہیں چھوڑتا کیوں کہ ظاہر و باطن دونوں پر مسلط ہے، اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے رزق و لیون بھی پاس کئے جا رہے ہیں، تجویز یہ بھی بن رہی ہیں، پروگرام بھی تیار ہو رہے ہیں، تلواریں بھی اٹھائی جا رہی ہیں، قلم بھی گھسے جا رہے ہیں، قدم بھی سفروں میں رگڑے جا رہے ہیں، زبانیں بھی معادوں میں رطب اللسان ہیں، لیکن دنیا ہے کہ اسے بے رزقی اور بدامنی چپک کر رہ گئی کہ چھوٹے نہیں پاتی۔

پھر یہ بھی نہیں کہ رزق کی پیداوار بند ہو جانے یا قحط سالی کی وجہ سے لوگ محروم رزق ہوئے ہیں، نہیں! بارش بھی ہے، پیداوار میں بھی کمی نہیں، غلہ کے گودام بھی بھرپور ہیں، اسٹاک خانوں میں منوں نہیں ٹنوں ہر نوع کا غلہ بھرا ہوا ہے، دکانیں بھی حوائجِ زندگی سے لبریز ہیں، لیکن بستی کے لوگ ہیں کہ بھوکے ہیں، ننگے ہیں اور رزق کے ڈھیر پر کھڑے ہوئے رزق کے لئے فریاد کر رہے ہیں، جن کی فریاد سننے والا کوئی نہیں؛ پس یہ صرف بے رزقی اور محرومی ہی نہیں بلکہ محرومی کے ساتھ ترسناؤ اور حسرت کا عذاب بھی سر پر مسلط ہے اس طرح کہ

چیز موجود ہے مگر ترسایا جا رہا ہے؛ اس قحط کی نوعیت ٹھیک وہی ہے جو حدیث نبوی میں بتلائی گئی ہے کہ ”آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا: جانتے ہو کہ قحط کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ قحط یہ ہے کہ بارش نہ ہو، پیداوار نہ ہو کہ خشک سالی ہو جائے، فرمایا: یہ قحط نہیں ہے، قحط تو یہ ہے کہ پیداوار خوب ہو مگر برکت اٹھالی جائے۔“ یعنی رزق ہونے کے باوجود ہر شخص خالی ہاتھ ہو اور رزق کے لئے روتا پھر رہا ہو، گویا کہ زبانِ حال سے اعلان کیا جا رہا ہو کہ سب کچھ ہے مگر تمہیں نہیں ملے گا، اسی طرح امن کے سلسلے میں بھی آج کی دنیا کی بد امنی کی نوعیت مجنبہ وہی ہے جن کا تذکرہ ذیل کی حدیث میں فرمایا گیا ہے:

حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود یا حاکم نہیں، میں بادشاہوں کا مالک اور دلوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں؛ بلاشبہ بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو رحمت و شفقت کے ساتھ ان کی طرف پھیر دیتا ہوں؛ اور جب بندے نافرمان ہو جاتے ہیں تو میں ان کے حکام و سلاطین کے دلوں کو غضب و غصہ اور سزا دہی کے جذبات کے ساتھ ان کی طرف پھیر دیتا ہوں جو انہیں بدترین عذاب و مصیبت کا مزہ چکاتے رہتے ہیں؛ پس اے لوگو! تم اپنے آپ کو بادشاہوں کے حق میں بددعا اور بدگوئی کرنے میں مصروف مت رکھو، بلکہ میری یاد اور میرے سامنے عاجزی سے جھکنے میں اپنے آپ کو مصروف کرو تو میں ہی تمہارے لئے ان حاکموں کے مقابلے میں کافی ہوں گا۔

بہر حال! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے رزقی اور بد امنی کے اسباب محض سیاسی اور رسمی ہی نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں جو خود ان ظاہری اسباب کے بھی اسباب ہیں؛ اور وہ باطنی اور معنوی ہیں جنہیں آنکھیں تو نہیں دیکھ سکتیں مگر دل پہچانتے ہیں؛ یہی معنوی اسباب ان ظاہری معاملات پر غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی خوبی اور خرابی واقعات پر اچھا اور برا اثر ڈالتی ہے، غور کیا جائے تو ان رزق و امن کو ختم کر دینے والے اسباب کا سبب

ایک ہی ہے اور وہ ہے معصیت و نافرمانی! ادھر رزق و امن پیدا کر دینے کا بنیادی اور معنوی سبب طاعت ہے؛ پس اس وقت کی بے رزقی اور بد امنی کی ذمہ داری درحقیقت ہمارے ہی افعال و حرکات پر عائد ہوتی ہے نہ کہ اغیار پر، گوسطی طور پر اس کا سبب اغیار نظر آئیں۔

اس کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک پھانسی پر لٹکی ہوئی لاش کے بارے میں چند آدمی غور و بحث کریں کہ اس کی موت کا سبب کیا ہوا ہے؟ ایک نے کہا کہ سبب کھلا ہوا ہے اور وہ پھندا ہے جو اس کے گلے میں پڑا ہوا ہے جس سے گلا گھٹا سانس بند ہوا اور موت واقع ہو گئی؛ دوسرے نے کہا کہ یہ صحیح ہے مگر یہ اصلی سبب نہیں، خود اس سبب کا دوسرا سبب ہے اور وہ یہ تختہ ہے کہ جب وہ پاؤں کے نیچے سے نکل گیا اور آدمی اس پھندے میں لٹک گیا تو پھندے نے گلے کو دبا دیا اور موت واقع ہو گئی، اس لئے اس کی موت کا اصلی سبب پھندا نہیں بلکہ تختہ ہے؛ تیسرے نے کہا کہ تختہ بھی موت کا اصلی سبب نہیں بلکہ اس کا سبب یہ بھنگی ہے جس نے تختہ اس کے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لیا جس کی وجہ سے وہ پھندے میں لٹک گیا، پس موت کا اصلی سبب تختہ نہیں بلکہ بھنگی کا فعل ہے؛ چوتھے نے کہا کہ بھنگی بھی اصلی سبب نہیں، کیوں کہ بھنگی کو خود مرنے والے سے ذاتی عداوت نہ تھی وہ مجسٹریٹ کے حکم سے مجبور تھا، اس لئے موت کا اصلی سبب بھنگی نہیں بلکہ مجسٹریٹ ہے جس نے بھنگی کو حکم دیا اس لئے بھنگی نے تختے کو حرکت دی اور اسے پھانسی لگ گئی؛ پانچویں نے کہا کہ تم میں سے ایک بھی اصل بنیادی سبب تک نہیں پہنچا؛ مجسٹریٹ کو اس کی موت سے کوئی ذاتی دلچسپی نہ تھی کہ وہ پھانسی کا حکم دیتا؛ اصل یہ ہے کہ اس مرنے والے نے خونِ ناحق کیا تھا، اس کا کیس عدالت میں آ کر ثابت ہو گیا تو مجسٹریٹ کو پھانسی دینے کے اختیارات استعمال کرنے پڑے، پس اصل میں اس میت کی موت کا بنیادی سبب خود اس کا جرم ہے، جرم نے مجسٹریٹ کو حکم قضا پر آمادہ کیا، حکم نے بھنگی کو حرکت دی، بھنگی نے تختے کو پاؤں کے نیچے سے کھینچا، اس کے ہٹ جانے سے پھندہ گلے میں لگا اور بالآخر موت واقع ہو گئی، پس موت کا ظاہری اور قریبی سبب تو پھندا ہے، مگر متعدد اسباب ظاہری و باطنی کے

سلسلے سے گزرتا ہوا اصل باطنی سبب خود مجرم کا جرم اور قانونِ وقت کی نافرمانی ہے، جس میں قتلِ ناحق کی ممانعت کر دی گئی تھی؛ گویا اس مجرم نے یہ جرم کر کے ایک ساتھ تین حق تلف کئے، ایک تو خدا کا حق تلف کیا کہ اس کے قانون کو توڑا، دوسرا پبلک کا حق تلف کیا کہ ان سے امن اٹھا دیا اور تیسرا اپنے نفس کا حق تلف کیا کہ جرم کر کے اس کی آبرو اور پاکیزگی ختم کر دی؛ اس لئے یہ اہلِ حقوق کی نگاہوں میں مبغوض ہو گیا؛ لیکن اگر قانون کی پابندی کرتا تو ان میں سے کسی کا بھی حق تلف نہ ہوتا؛ خلاصہ یہ نکلا کہ اس میت کی اپنی جان سے محرومی، عزت سے محرومی، پبلک کی ہمدردی سے محرومی، رحمتِ الہی سے محرومی، طعام و قیام سے محرومی، پھر اوپر سے تمام نعمتوں کے سلب کر لئے جانے کی آفتِ قانونِ وقت کی فرماں برداری چھوڑ دینے سے واقع ہوئی، اگر یہ قانون کے احترام میں اس کا پابند رہتا تو ان میں سے ایک محرومی بھی سر نہ پڑتی، جس سے صاف واضح ہو گیا کہ نعمتوں کا باقی رہنا قانون کی پابندی میں ہی مضمر ہے، اور نعمتوں کا سلب ہو جانا قانون کی نافرمانی اور معصیت میں پوشیدہ ہے؛ ظاہر ہے کہ جب عقلی قوانین کی نافرمانی کے یہ آثار ہیں کہ نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں تو روحانی قانون کی نافرمانی سے نعمتوں کا چھن جانا اور بالخصوص قلبی نعمتوں — سکونِ قلب، بشاشتِ دل، راحتِ روح اور طمأنینہِ باطن — کا چھن جانا مزید برآں ہے؛ پس امن و رزق کا تعلق صرف — معاہدوں، رزولوشنوں اور تجاویز سے نہیں بلکہ قوموں کے کردار، کیریکٹر، کیفیاتِ نفس اور قانونِ الہی یا قانونِ فطرۃ سے وابستگی کی نوعیت سے کہیں زیادہ ہے؛ اس لئے بقاءِ نعمت اور سلبِ نعمت کا حقیقی سبب قانونِ الہی کی اطاعت — جسے عبادت کہتے ہیں — اور قانونِ الہی کی نافرمانی — جس کو معصیت کہتے ہیں — قرار دیا جاتا ہے؛ قرآنِ کریم نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا کہ:

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (سورۃ قریش: ۲)

تو (اس نعمت کے شکریہ میں) ان کو چاہئے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں

کھانے کو دیا اور خوف سے امن دیا۔

گویا رب کریم کا بھوک سے نجات دینا اور خوف سے امن دینا اس وجہ سے ہے کہ لوگ اس بیت کریم (کعبہ محترمہ) کے رب کی عبادت کریں جس کا مفہوم مخالف یہ ہوا کہ اگر عبادت سے غافل ہو جائیں گے تو نہ بھوک سے نجات پاس کیں گے نہ خوف کی بلاء سے بچ سکیں گے، قحط بھی مسلط ہوگا اور خوفِ اعداء بھی سرپڑے گا۔

اسباب ظاہری کے ساتھ اسباب باطنی کا لزوم

افزائشِ رزق و امن کے اسباب جو کچھ بھی اب تک کی تقریر میں بیان کئے گئے ہیں میں ان کی نفی نہیں کرتا، وہ ظاہری اور سطحی اسباب ہیں، اور جب تک اس ظاہری اور نمائشی عالم میں رہنا ہے ان کے اختیار کرنے سے چارہ کار بھی نہیں ہے، مگر انسانیت کا مدار محض ظاہری بدن اور مادی اشیاء پر نہیں، بلکہ اس کے ساتھ روح اور باطن بھی لگا ہوا ہے، اس لئے محض مادی وسائل ہی اس کے سامنے نہ رہنے چاہئیں، بلکہ روحانی اسباب بھی پیش نظر رہیں جب کہ بدن کے ساتھ روح کا جوڑ بھی لازمی ہے۔ اس لئے جہاں ہمیں اسباب ظاہری کی طرف توجہ کرنی پڑے گی وہیں اس سے کہیں زیادہ اسباب باطنی کی طرف بھی جھکتا پڑے گا؛ اور جیسے ہم دنیا میں رہتے ہوئے روح سے قطع تعلق اور محض بدن پر قناعت کر کے زندہ نہیں رہ سکتے ایسے ہی ہم ان روحانی اسباب سے منقطع ہو کر محض مادی اسباب پر بھروسہ کر کے نہیں بیٹھ سکتے؛ پس جہاں ہمیں مادی قوانین درکار ہوں گے وہیں ہمارے لئے اخلاقیات بھی ناگزیر ہوں گی؛ قانونِ محض جس میں اخلاقیات اور روحانیت نہ ہو دنیا کے لئے کبھی بھی نجات اور امن و سکون کا ذریعہ نہیں بن سکتا، بلکہ مادہ سے زیادہ روح کی ضرورت ہے، کیوں کہ روح

کے بغیر تو مادی ڈھانچے کا بقاء ناممکن ہے جبکہ مادی ڈھانچوں کے بغیر روح کا قیام ممکن ہے، جیسا کہ دنیا کی تمام ملتیں اسے مانتی ہیں اور اس پر عقلی اور نقلی دلائل قائم ہیں؛ اور روح و روحانیت کا سرچشمہ خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے؛ اس لئے دنیا میں امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں خدا سے منقطع ہو کر اور اس کے اٹل فطری قانون سے بے تعلق رہ کر امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کا خیال جنون اور مایوسگی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا؛ پس کسی بھی شعبہ زندگی سے پراگندگی، نفرتِ باہمی، بے اعتمادی، فرقہ وارانہ کشمکش، فرقہ واریت — جس کے ثمرہ کے طور پر بے رزقی اور بد امنی پھیلتی ہے — اس وقت تک ہرگز مٹ نہیں سکتے جب تک کہ ان بکھرے ہوئے عناصر کا اللہ کی جامع ذات کی طرف رجوع نہ ہوگا؛ کیوں کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ عالم کے ان بکھرے ہوئے اجزاء کو نہ وطن جوڑ سکتا ہے کہ اس میں خود حد بندی اور تفریق داخل ہے، نہ نسل و خون جوڑ سکتا ہے کہ اس میں خود تفاوت و اختلاف ہے، نہ قومیت جوڑ سکتی ہے کہ اس میں تلون اور گورے کالے کی تفریق ہے۔ بلکہ وہی نام جوڑ سکتا ہے جس کے مسمیٰ میں نہ حد بندی ہے نہ تفریق ہے نہ جزئیت ہے نہ ٹکراؤ ہے بلکہ وحدانیت ہے، یکتائی ہے، محبوبیت ہے، مرکزیت مطلقہ ہے، جو تمام بکھرے ہوئے مواد و عناصر کو اپنے نام پر جمع کئے ہوئے ہے، جتنا اس کے نام سے علیحدگی ہوتی ہے تفرقہ پھیلتا ہے، بکھراؤ بڑھتا ہے اور جتنا اس کے نام کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے جمعیۃ خاطر سکونِ دل اور دولت و بشارت نصیب ہوتی ہے جو جمع اور اجتماع کی روح ہے۔

بہر حال آپ کی چاروں خواہشوں کا حل میں نے اردو زبان میں پیش کر دیا، آپ جہاں ان کو سیاسی طور پر حل کریں وہاں شرعی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کریں کہ اس کے بغیر پرسکون، پرامن اور باخیر زندگی کی کوئی صورت نہیں۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیقِ عمل عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند
 یکم ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ - ۳/ ستمبر ۱۹۵۱ء

بنیادی انسانی حقوق اور خطبہ حجۃ الوداع

بسم اللہ الرحمن الرحیم
 وبہ نستعین

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى اما بعد!

انسان

اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا خالق و مالک ہے، اسی نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو بھی پیدا فرمایا؛ جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا و ابونا آدم علیہ السلام کے جسدِ خاکی کو تیار فرمایا تو اسی جسد کی بائیں پسلی سے ان کی زوجہ حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام نے جب ان کی جانب نظر کی تو انہیں اپنے ہی جسم کے ایک حصے سے بنی حوا کی طرف قلبی التفات اور طبعی انس و یگانگت محسوس ہوئی، گویا اسی انسیت کی وجہ سے یہ مخلوق اور اُس کی ذریت انسان کے

نام سے موسوم ہوئی۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات پر شرف و فضیلت عطا فرمائی، سب سے پہلے تو یہی کہ اس مخلوق کو اپنے ہاتھوں سے — ہاتھ سے جو بھی مراد ہو — پیدا فرمایا، جب کہ ساری مخلوق کو محض حکم گن سے پیدا کیا؛

پھر تمام مخلوقات کے مقابلے میں اُسے احسن تقویم پر پیدا کیا، یعنی نہایت ہی حسین و جمیل اور نہیم و عقیل بنایا؛ اسے تمام اسماء کا علم اپنے خزانہ غیب سے عطا فرمایا؛ فضیلتِ علم سے

۱۔ روایات میں ہے کہ جب فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ ”زمین پر اپنا غلغلا انسان کو بنانے کے بجائے ہمیں بنایا جائے کہ ہم صرف تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں معصیت و نافرمانی نہیں کرتے“ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: میں نے جس کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے اس پر ان کو ترجیح دینا نہیں چاہتا جو میرے حکم سے پیدا ہوئے ہیں۔

سرفراز کرنے کے بعد فرشتوں جیسی نورانی و قدسی مخلوق سے اُسے سجدہ کروایا؛ پھر کائناتِ ارضی کا نظام سپرد کر کے اسے زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ قرار دیا؛ اسی طرح اُسے اپنے خطاب کا اہل اور اپنے احکام کا مکلف بنایا؛ نیز بحر و بر پر غلبہ و قدرت عطا کر کے اس کی تکریم فرمائی؛ اور طیب و پاکیزہ چیزوں کو اس کی روزی بنا کر اپنی شانِ تقدس و پاکی سے نسبت نصیب کی؛ مختصر یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا نہایت ہی معزز و مکرم شاہ کار بنایا ہے۔

انسانیت

جب انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں اس قدر عزت و اکرام اور امتیازی مقام عطا فرمایا تو پھر کیوں اس کے مقام کی حفاظت اور اس کے احترام کے بقاء و تسلسل کا انتظام نہ فرماتا، چنانچہ آپ دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ شریعتِ اسلامی کے بنیادی مآخذ یعنی کتاب و سنت میں بے شمار احکامات تو براہِ راست انسانیت کے حقوق سے متعلق شامل ہیں اور غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو پوری شریعت ہی انسانیت کے احترام کو ملحوظ رکھنے، اس کے حقوق ادا کرنے، اس کو اپنے رب کی معرفت دینے اور قرینہ بندگی و نیاز مندی سکھا کر اُخروی نعمتوں کا

حق دار بنانے کے لئے اُتاری گئی ہے۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ملکوتیت، بہیمیت، اور شیطنیت کی صفات کا مجموعہ ہے، جب تک وہ آسمانی تعلیمات اور انبیاء علیہم السلام کی صفات سے متصف رہتا ہے اس وقت تک اس کے اندر ملکوتیت غالب رہتی ہے اور جب اسے چھوڑ دیتا ہے تو بہیمیت کی سطح پر اُتر آتا ہے، جب بہیمیت حد سے گذر جاتی ہے تو طاغوتی اور شیطانی حرکات پر آمادہ ہو کر انسانیت و آدمیت کا امتیاز گھو بیٹھتا ہے، یہاں تک کہ انسانیت کے لئے ننگ و عار بن کر رہ جاتا ہے۔

جب دنیا میں یہ صورتِ حال عام ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو نبوت عطا کر کے مصلحانہ شان کے ساتھ کھڑا کرتا اور اس کے ذریعے شیطنیت و بہیمیت میں ڈوبی انسانیت کو اس گندگی سے باہر نکال کر پھر سے انسان بنا دیتا ہے؛ سیدنا و حبیبنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی ایسے ہی حالات میں ہوئی، ساری دنیا میں انسانیت دم توڑ رہی تھی اور آدمیت آدمیت کو ترس رہی تھی؛ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا تھا اور آپ کے تشریف لانے سے پھر کیا ہو گیا اُس کی ایک جھلک چشم سر سے دیکھنا چاہیں تو صحابی رسول حضرت جعفر طیارؓ کی وہ جامع و مختصر تقریر سن لینا کافی ہے جو انہوں نے شاہِ حبشہ کے دربار میں فرمائی تھی۔

انسانیت کے محسن اعظم

اے بادشاہ! ہم ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے اور مردار کھایا کرتے تھے، بدکاری اور قطع رحمی میں مبتلا تھے، پڑوسیوں کی حق تلفی کیا کرتے تھے، ہمارا طاقت ور ہمارے کمزوروں کو کھاتا تھا، ہم ایسی ہی (انسانیت سوز) حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ہی ایک رسول کو مبعوث فرمایا، جن کے حسب و نسب، طہارت و عفت اور صدق و دیانت کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں، انہوں نے ہمیں پتھروں اور خود ساختہ بتوں کی پوجا چھوڑ کر اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی کی طرف آنے کی دعوت دی؛ ہمیں سچ بولنے، امانتوں کو ادا کرنے

صلہ رجمی کرنے، پڑوسیوں کا خیال رکھنے، اور ظلم و قتل سے بچنے کا حکم دیا، ہمیں بُرے کام کرنے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال ہڑپ کر لینے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا، ہمیں توحید، نماز، زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ کی تعلیم دی تو ہم نے ان کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لے آئے۔

غور کیجئے! نبی کریم ﷺ اور ان کی دعوت کے تعارف پر مبنی اس مختصر مگر جامع و مانع تقریر جعفری میں اکثر حصہ اور زیادہ تر امور انسانوں کے حقوق کے احترام اور آدمیت و انسانیت کی بحالی کے اہتمام سے متعلق ہی دکھائی دیتے ہیں؛ واقعہ یہ ہے کہ اسلام انسانیت کی بحالی و تکمیل ہی کا دوسرا نام ہے، اسلام کا سورج انسانیت پر طلوع ہوتا ہے، اسلام کا نور انسانیت ہی میں جگمگاتا ہے، اسلام کا جلوہ انسانیت ہی میں نظر آتا ہے خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا: خیار کم فی الجاہلیۃ خیار کم فی الاسلام اذا فقہوا۔۔۔

آدمیت کے احترام اور انسانیت کے مقام پر مختصر روشنی ڈالنے کے بعد اب نبی کریم ﷺ کے خطبہ حجتہ الوداع کی روشنی میں انسانوں کے چند بنیادی حقوق (ہیومن رائٹس) کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

خطبہ حجتہ الوداع^۱

اس سلسلے میں آپ ﷺ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ جامع و مانع، مختصر مگر مکمل وہ خطبہ ہے جو آپ نے حجتہ الوداع کے دوران میدانِ عرفات میں کوئی دیر ھلاکھ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے اہتمام اور خاص شان سے دیا تھا، پھر اُسے غائبین — یعنی بعد میں آنے والوں — تک پہنچا دینے کی تاکید بھی فرمائی تھی، اس خطاب میں بطور خاص انسانوں کے حقوق ادا کرتے رہنے کی طرف امت کو متوجہ فرمایا تھا اس لئے اس خطبے کو بجا طور پر حقوقِ انسانی کا اسلامی منشور کہا جاسکتا ہے؛ موضوع کی مناسبت سے اس وقت اس تاریخی خطبے سے — ایمانیات و عبادات سے متعلق دفعات کو حذف کر کے — صرف

حقوقِ انسانی سے متعلق دفعات نمبر وار پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) جاہلی افکار کا اعتقاد

انسانی حقوق تلف کر کے ان کے ساتھ نا انصافی اور ظلم و زیادتی پر مبنی ضوابط و دورِ جاہلیت کی دین تھے، ظاہر کہ انسانی حقوق کی بحالی کے واسطے سب سے پہلے اس دورِ جاہل و ظلم کے خود ساختہ اور ظالمانہ قواعد و ضوابط کا خاتمہ اور ان کی نفی ضروری تھی، اس لئے آپ ﷺ نے اس وقت قاعدہ کلیہ کے طور پر سب سے پہلے یہ اعلان فرمایا:

اے نبی کریم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ایک ہی مرتبہ حج ادا فرمایا اور وہ بھی زندگی کے آخری سال، چوں کہ اس کے بعد آپ پورا ایک سال بھی دنیا میں تشریف فرما نہ تھے اس لئے اس حج کو حجۃ الوداع کہتے ہیں، حج کے دوران آپ نے مختلف مواقع پر اسلام کے بنیادی احکام بڑے اہتمام کے ساتھ پیش فرماتے رہے اور اشارے کئے میں ان خطابات کا اعتقادی خطابات ہونا بھی ظاہر کرتے رہے۔

”جاہلیت کی خود ساختہ تمام رسوم، خیالات و اعتقادات میرے دونوں قدموں تلے روندے اور مٹائے جا چکے ہیں“ یعنی اب انہیں کبھی اٹھایا اور اُبھارا نہ جانا چاہئے، کیوں کہ جب تک وہ موضوع رہیں گے برکاتِ اسلامی باقی رہیں گی، جب انہیں اُبھارا جائے گا انسانیت پھر سے ظلم و جاہل کے دلدل میں پھنستی چلی جائے گی۔

(۲) ذاتِ پات کی بیخ کنی

ان جاہلی رسوم میں انسانی برادری کے درمیان اونچ نیچ اور ذاتِ پات کی تقسیم بھی داخل تھی، جس کی وجہ سے انسانیت کسی ایک حق سے نہیں بے شمار حقوق سے محروم ہو چکی تھی؛ آپ ﷺ نے اپنے زمانہ دعوت میں صحابہ کرامؓ کے ذہنوں سے ذاتِ پات کے بُت کو نکال باہر کر کے ان کے درمیان مساواتِ انسانی قائم فرمادی تھی، ان کو بلا لحاظِ مرد و عورت اور بلا لحاظِ مذہب و ملت انسانی حقوق کا احترام کرنا سکھایا تھا، اس لئے آج کے خطبے میں اس مسئلے کو بطورِ خاص اٹھایا اور ارشاد فرمایا:

”لوگو! تمہارا رب یعنی مالک و پروردگار بھی ایک ہے اور تمہارا آب یعنی نسلِ انسانی

کی اصل بھی ایک ہے، پس تمہیں چاہیے کہ نسلی امتیازات اور نسبی مباہات کو اپنے درمیان دوبارہ سر اٹھانے نہ دو، ایک خاندان اور ایک برادری بن کر رہو، اخوت و بھائی چارگی کی فضاء قائم رکھو۔

(۳) نسلی امتیاز کا تعاقب

اسی کی مزید تفصیل اور وضاحت کرتے ہوئے اور علاقائی، لسانی، اور اقتصادی تقاریر کا قلع قمع کرتے ہوئے بتلادیا کہ اب کبھی ان تکوینی و تخلیقی تنوعات کے حوالے سے ایک دوسرے پر برتری جتانے کا کسی کو حق نہ رہے گا، فرمایا: ”کسی عربی کو عجی پر، اور کسی عجی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، فضیلت صرف ایمان اور پرہیزگاری کے معیار سے وابستہ ہے۔“

(۴) سماجی اونچ نیچ کی نفی

جاہلیت میں غلاموں اور باندیوں کو استعمال تو بہت کیا جاتا تھا مگر ان کے ساتھ سلوک اچھا نہیں کیا جاتا تھا، ان کے بنیادی حقوق انسانی تک کی پروا نہیں کی جاتی تھی، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے ہر چیز میں انہیں نظر انداز کیا جاتا اور امتیازی سلوک برتنا عام تھا؛ آپ ﷺ نے عمر بھر اپنے قول و عمل سے اس نابرابری و زیادتی کی مخالفت فرمائی تھی، انہیں آزاد کرنے کے فضائل بیان کر کے تدریجاً ان کی تعداد کم کی اور اس سلسلے ہی کے ختم ہو جانے کے اسباب بنادیئے تھے؛ وداعی خطبے کے اس اہم موقع پر انہیں فراموش نہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”لوگو! اپنے غلاموں باندیوں کا دھیان رکھو، انہیں نیچ سمجھ کر امتیازی سلوک نہ کرو، جو تم کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ اور جو تم پہنو وہی انہیں پہناؤ“

ظاہر ہے کہ غلاموں کے ساتھ جاری سماجی نا انصافی اور معاملات میں نابرابری کے خاتمے کے لئے یہ ہدایت بالکل قطعی اور واضح راہ نمائی ہے۔

(۵) مرد و عورت کے حقوق

عورتیں اسلام سے قبل سماج کا مظلوم طبقہ تھیں، ان کے ساتھ ہر طرح کی نا انصافی اور ظلم کو روا رکھا جاتا تھا، انہیں ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا اور ان کے تمام انسانی حقوق پامال کئے جاتے تھے؛ آپ ﷺ نے تیس سالہ زمانہ دعوت و تربیت میں اس ظلم کا یکسر خاتمہ فرما کر عورت کو ”بنیادی انسانی حقوق میں“ مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑا فرما دیا تھا؛ اس آئینی و قانونی ہدایت نامے میں بطور خاص ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”لوگو! عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں اللہ سے ڈرو، تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امان کے حوالے سے اپنی بیوی بنایا ہے، اور اللہ کا نام لے کر انہیں اپنے لئے حلال کیا ہے، اس لئے ان کے ساتھ بھلائی کا میں تمہیں پابند کرتا ہوں، وہ تمہارے ماتحت ایک قیدی کی طرح ہیں، وہ تمہاری کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، تم پر لازم ہے کہ تم انہیں اچھے طریقے پر کھلاؤ اور پہناؤ اور ضروریات کا تکفل کرو، میں ان کے سلسلے میں تمہیں خاص وصیت کر رہا ہوں اس کا دھیان رکھو؛ اسی طرح عورتوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ تمہارے بستر اور گھر کی حفاظت کریں، تمہاری مرضی کے بغیر کسی کو گھر میں نہ بلائیں، کسی بُرے کام کا ارتکاب نہ کریں، خدا نخواستہ وہ ایسا کر بیٹھیں تو تمہیں اظہار ناراضگی کے طور پر ان سے علاحدہ سونے یا ہلکی پٹائی کرنے جیسی مناسب تادیب کا حق حاصل ہے“

(۶) خانہ جنگی کی تردید

معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کا خون بہانا، لمبی لمبی جنگیں لڑ کر ہوس انتقام کی تسکین کرنا جاہلیت میں عام تھا، ظاہر ہے کہ یہ انسانیت پر ظلم اور اس کے حقوق تلف کرنے کے مترادف ہے؛ آپ ﷺ نے اس رسم بد پر قدغن لگا کر حق انسانی کی وضاحت فرمادی، ارشاد فرمایا:

”جاہلیت کے تمام خونی معاملات اب ختم کر دیئے گئے، لوگوں کو چاہیے کہ اب اس

سلسلے کا خاتمہ کر دیں، سب سے پہلے میں اپنے خاندان کی طرف سے ربیعۃ ابن الحارث کے بیٹے کا خون معاف کرنے کا اعلان کرتا ہوں کہ اب اس سلسلے میں میرا خاندان کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرے گا۔“

”دیکھو! میرے بعد تم لوگ گمراہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی خوں ریزی اور آپس میں قتل و غارت گری کرنے لگو“

(۷) مالیاتی مظالم کا صفایا

ساہوکاری اور ربوی کاروبار کے ذریعہ دولت مندوں نے غریبوں اور محتاجوں کا خون چوسنے کو پسندیدہ مشغلہ بنا رکھا تھا، بے چارے ضرورت مند غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان ساہوکاروں کے پاس جاتے اور قرض ادھار حاصل کر لیتے، یہ ساہوکار تمام انسانی ہمدردیوں اور آدمیت کے تقاضوں سے معزّی ہو کر ان غریبوں پر سود پر سود بڑھاتے چلے جاتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کا یہ طرز عمل انسانیت کا گلا گھونٹنے کے مترادف تھا، آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں قرضِ حسنہ یعنی اللہ قرض دینے کی فضیلتیں بیان کیں تھیں، مقرض کو مہلت دینے پر اجر و ثواب کے وعدے فرمائے تھے، سودی کاروبار اور ربوی معاملات کو انسانی سماج کے ساتھ ظلم و نا انصافی قرار دیا تھا؛ اس تاریخی خطبے میں آپ اس اہم موضوع سے کیوں چشم پوشی فرماتے؟ ارشاد ہوا:

”جاہلیت کے تمام سودی معاملات آج ختم کر دئے جارہے ہیں، اب کوئی کسی سے بڑھا چڑھا کر اپنا مال طلب نہیں کر سکتا، گذشتہ قرضوں میں سے بھی صرف حقیقی قرض واپس لے لو اور سود خواہ کتنا بھی چڑھ گیا ہو سب معاف کر دو؛ سب سے پہلے میں اس قانون پر عمل کرتے ہوئے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا وصول طلب سود معاف کر رہا ہوں“

(۸) ترکہ و میراث کا تحفظ

عام طور سے باپ کے مرنے کے بعد اولاد میں جو طاققت ور ہوتا وہ اس کی میراث پر

قبضہ کر بیٹھتا تھا جب کہ کمزور وارث اس سے اپنا حق طلب کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے؛ اسی طرح بعض ظالم لوگ مرتے وقت اپنے مال میں ایسی وصیتیں کر جاتے جو وارثین کی حق تلفی کا سبب ہوتیں، آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں اس کا بہت خیال رکھا اور تمام جاہلی روایات کا خاتمہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق میراث کی تقسیم کا ایک نئی برانصاف ضابطہ بنا دیا تھا، جس میں اگرچہ ایک تہائی مال کی حد تک وصیت کی گنجائش رکھی گئی مگر اس گنجائش کو اضرار — یعنی کسی وارث کو نقصان پہنچانے — کے لئے استعمال کرنے پر پابندی لگا دی؛ اس موقع پر ایک عام ضابطے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے میراث کے احکام نازل کر کے ہر حق دار کو اس کا واجب حق ادا فرما دیا ہے؛ لہذا اب وارثین کے حق میں کسی وصیت کی ضرورت نہ رہی“

اس اجمالی اعلان کے علاوہ آپ کی تعلیمات میں صراحت موجود ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی وصیت میں کسی حق دار کو ضرر پہنچانے کی کوشش کی تو وہ جنت میں داخلے سے محروم رہے گا خواہ ساٹھ برس تک طاعات و عبادات میں مشغول رہا ہو۔

(۹) بددیانتی کی مذمت

انسانوں کی جانوں کی طرح ان کے اموال بھی قابل حفاظت ہیں مگر جب انسان پر شیطانی و طاعوتی قوت غالب آ جاتی ہے تو پھر وہ بجائے ان کا محافظ بننے کے خود غاصب بن کر چوری کے ذریعہ، دھوکہ دہی کے ذریعہ، امانتوں میں خیانت کے ذریعہ، غرض جس طرح ممکن ہو اس طرح دوسرے کا مال ہڑپ کرنے لگتا ہے؛ آپ ﷺ مدّت العمر دیانت و امانت کی، اکل حلال اور کسب حلال کی تعلیم دیتے رہے، کسی کا مال ناحق استعمال کرنے پر سخت وعیدیں سنائیں تھیں، حجۃ الوداع کے اس اجتماع میں اس مسئلے کی جانب توجہ دلانے کو بھی آپ نے ضروری خیال فرمایا:

”لوگو! قرضے ادا کئے جانے چاہئیں، امانتیں واپس ہونی چاہئیں، اسی طرح ضمانتوں کو

ذمہ داری سے پورا کرنا ضامن پر لازم ہوگا“
 ”کسی مسلمان کے لئے کسی اور کا مال لینا اس کی دلی خوشی و رضامندی کے بغیر حلال
 نہیں ہے، ایسی حرکت کر کے اپنے آپ پر ظلم مت کرو“

(۱۰) ظلم و زیادتی کا استرداد

انسانوں کے ساتھ ایک ظلم اور نا انصافی یہ ہوتی ہے کہ بسا اوقات کسی کے جرم اور قصور کا وبال کسی اور پر ڈال دیا جاتا ہے، مثلاً باپ کے قصور کا وبال بیٹے پر ڈال دیا جائے، یا بیٹے کے قصور کا وبال باپ پر، اسی طرح طاقت ور کی غلطی ضعیف و کمزور کو بھگتنی پڑے، یا بااثر کو چھوڑ کر بے اثر اور دست نگر کو سزا میں ماخوذ کر لیا جائے وغیرہ؛ آپ ﷺ نے اس وقت کے سماج میں جاری اس ظلم کا عملاً قلع قمع فرما کر انسانی سماج کو اس حق تلفی سے بچا لیا تھا؛ مگر اس موقع پر اس کے ذکر کو ضروری سمجھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”سنو لوگو! مجرم اپنے جرم کا خود ذمہ دار رہے گا، کسی دوسرے پر اس کا وبال ڈالنا درست نہ ہوگا، کوئی باپ بیٹے کے قصور کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جاسکتا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے پاپ کا جواب دہ ہوگا۔“

(۱۱) حقوق انسانی کا احترام

سب سے بڑی چیز انسان کی جان، مال، اور آبرو کا تحفظ ہے، مجموعی طور پر تمام حقوق انہی تین چیزوں سے متعلق اور انہی میں دائر ہیں؛ پیغمبر اسلام ﷺ کی مبارک تعلیمات اور واضح ہدایات میں قولاً و عملاً ان حقوق کی جس قدر تاکید آئی ہے وہ کسی اور جگہ نظر نہ آئے گی؛ اس کے باوجود بہتر انسانی سماج کی تشکیل اور بقاء کے لئے دیئے جانے والے اس تاریخی منشور میں آپ نے اس مسئلے کو شامل رکھنا ضروری سمجھا اور بڑے پیارے ددل نشیں انداز میں پیش فرمایا؛ آپ ﷺ نے پہلے لوگوں کو کا ذہن حج کے اس مہینے کی حرمت و عزت کی طرف متوجہ کیا، پھر مکے کی اس مبارک سرزمین کی عظمت و قیمت کی یاد دہانی فرمائی، پھر

عرفنے کے دن کی اہمیت واشگاف کی، اس کے بعد فرمایا:

”لوگو! آج سے تمہاری جانیں، تمہارے مال، اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کے دن کی، اس مہینے کی، اور اس شہر کی توہین تم پر حرام ہے، اب قیامت تک کسی کے لئے کسی کا ناحق خون کرنے، ناحق مال لینے، اور بے عزتی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے“^۱

خلاصہ کلام

غور کیجئے تو حقوقِ انسانی میں سب سے بنیادی حقوق یہی تین ہیں کہ ۱۔ اس کی ذات

۱۔ میں نے اس خطبے کی متعدد روایتوں کو سامنے رکھ کر اور ترتیب کو آگے پیچھے کر کے عنوان دارانِ دفعات کو جمع کیا ہے، اس لئے یہ بعینہ کسی ایک روایت کا ترجمہ نہ سمجھا جائے۔

ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو، ۲۔ اس کے اموال و املاک ہر تغلب و ہلاکت سے مامون ہوں اور ۳۔ اس کی عزت و ناموس کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔

پیغمبر اسلام سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی جامع و مانع تعلیمات اور اپنی بے مثال و بے نظیر تربیت میں ان تینوں امور کو بنیادی اہمیت کے ساتھ ملحوظ و محفوظ رکھا، بلا لحاظِ مذہب و ملت انسانوں کے احترام کی ہدایت دی، ان کے حقوق و آداب سکھائے، اس کی خلاف ورزی پر دنیوی و اخروی سنگین نتائج سے باخبر فرمایا۔

مثلاً نفسِ انسانی کے تحفظ کے لئے قتلِ اولاد کو حرام قرار دیا، خودکشی کو مذموم اور قابلِ مواخذہ جرم بتلایا، ایک دوسرے کو ناحق قتل کرنے کو کفر کے مترادف بتلایا، ایک انسان کے ناحق ہلاکت کو پوری انسانیت کی ہلاکت کے برابر جرم فرمایا، حتیٰ کہ ناگزیر جنگوں اور مقابلوں کے دوران بھی نفسِ انسانی سے ناروا سلوک کی ممانعت کر دی، انسانی لاشوں کا مثلاً کرنے اور ان کے مردہ اجسام کی توہین کرنے تک سے اُمت کو روک دیا، جرائم پر سزائیں دیتے وقت

بھی ان کے حق نفس کو ملحوظ رکھنے کی تاکید فرمائی، وغیرہ۔

املاکِ انسانی کے تحفظ کے سلسلے میں ایسی ہدایات جاری فرمائیں کہ ان پر عمل کر لیا جائے تو کسی شخص کے مال کو ذرہ برابر خطرہ اور کسی قسم کا خدشہ لاحق نہیں ہو سکتا، چوری اور ڈاکے کو تو حرام اور قابلِ سزا جرم بتلایا ہی دل کی خوشی کے بغیر کسی کا مال کھانا بھی حرام فرما دیا، آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق استعمال کرنے پر پابندی لگا دی، ارشاد فرمایا کہ: ”جو شخص کسی کی زمین، جانور، کپڑا، یا کوئی بھی مال ناحق طریقے پر لے لے گا تو کل قیامت میں وہ سر پر اٹھا کر لائے گا جس کے بوجھ تلے دبتے ہوئے مجھ سے مدد کا طلب گار ہوگا مگر یاد رکھو کہ ایسے ظالم کی میں ہرگز مدد نہ کروں گا“ حدیہ ہے کہ غرباء کی مدد کے لئے مال داروں کے مال میں جو معمولی ساق شریعت کی جانب سے متعین کیا گیا ہے اور وہ حق اللہ کہلاتا ہے اس کی وصولی میں بھی چُن چُن کر اچھا مال نکالنے کو ناجائز بتلایا وغیرہ

اور جہاں تک انسان کی عزت و آبرو کا مسئلہ ہے تو اس کے سلسلے میں اتنے تفصیلی اور غیر معمولی احکام ہیں کہ ان کی جانب اشارہ بھی ایک طویل مضمون بنادے گا؛ حُرمتِ آبرو کے تحفظ ہی کے لئے غیبت یعنی پیٹھ پیچھے بُرائی کرنے کو حرام قرار دیا، کسی کے سامنے رُسوا کرنے کی ممانعت فرمادی، کسی کے عیب پر ہنسنے اور حقارت سے دیکھنے کو بدترین جرم بتلایا، بدگمانی کرنے اور تحقیق کے بغیر بُرا سمجھنے پر مواخذہ کی وعید سنائی، بدکاری کا الزام نہ ثابت کر سکنے پر اسی کوڑے لگا کر گواہی کے اعتبار سے محروم کر دیا، ہر دعوے کے ثبوت میں دو گواہ تسلیم کر لئے مگر زنا کے ثبوت کے لئے چار عینی شاہدین کا پیش کرنا ضروری فرمایا گیا، ہر قسم کی اونچ نیچ، اور ہر طرح کی تفریق و تقسیم پر پابندی لگا دی گئی، رشتہ داریوں کا احترام بھی اسی میں داخل ہے، حجاب کا حکم بھی اسی حُرمت و عزتِ نفس سے متعلق ہے، پڑوسی کے حقوق بھی اسی لئے ہیں، ملاقات کے آداب بیماروں کی خدمت، راستے کے حقوق غور کیا جائے تو یہ اور ان جیسی تمام تعلیمات انسانی مرتبوں کی رعایت اور عزت کی حفاظت اور حقوق کی حُرمت ہی سے